سیپیاں اور پتھر

خورشید قائم خانی

سیپیاں اور پتھر

خورشید قائم خانی

فکشن ہاؤس
۱۸- مزنگ روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب = سیپیاں اور پتھر
مصنف = خورشید قائم خانی
پبلشرز = فکشن ہاؤس
18_ مزنگ روڈ، لاہور
فون: 7249218, 7237430
پروڈکشن = ظہور احمد خاں / رانا عبدالرحمٰن
معاون = ایم سرور
پرنٹرز = پریمیئر پرنٹرز لاہور
سرورق = ریاظ
اشاعت = 1996ء
قیمت = 100 روپے

فہرست

پیش لفظ پروفیسر فرید شیخ ۵
۱۔ فیصلہ ۹
۲۔ سر آنگس فریزر ۱۳
۳۔ بہن فرانسیسکہ ۱۸
۴۔ میزبان ۲۳
۵۔ ھارلیم ۲۸
۶۔ جپسی عورت مارتھا ۳۳
۷۔ ہاتھی کے دانت ۳۸
۸۔ باپسی سدھوا ۴۲
۹۔ روح کا ناچ ۴۶
۱۰۔ کافی شاپ ۵۱
۱۱۔ امریکی کتے اور بلیاں ۶۰
۱۲۔ مونا بارینٹ ۶۶
۱۳۔ موت کا منظر ۷۶
۱۴۔ وحشی مغرب ۸۳
۱۵۔ اوریگون ٹریل ۸۹

۱۶۔ جپسی قبرستان ۹۴

۱۷۔ سپیاں اور پتھر ۹۹

۱۸۔ الماماتر ۱۰۶

۱۹۔ لوس اینجلس ۱۱۰

۲۰۔ میکسیکو کی سیر ۱۱۵

۲۱۔ پونکہ چیف کا مقدمہ ۱۲۱

۲۲۔ نجمہ آئشے ۱۳۰

۲۳۔ خواب ۱۳۴

۲۴۔ بھیل بستی ۱۳۷

پیش لفظ

سیپیاں ابدی علامت ہیں، نفاست، پاکیزگی، لطافت اور صداقت کی۔ جبکہ پتھر کرختگی، سخت گیری اور بھاری پن کا مظہر ہیں۔ بادی النظر میں یہ دونوں علامتیں دو متضاد حقائق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ لیکن یہی تضاد ایک حسین سنگم کی شکل میں ہمیں معاشرے کے ان جیتے جاگتے کرداروں میں نظر آتا ہے جو تاریخ کے صفحات میں افسوس وہ جگہ حاصل نہ کرسکے جس کے وہ مستحق تھے۔

امریکہ کا پونکا ریڈ انڈین چیف، جپسی عورت مارتھا (قسمت بتانے والی) اور سندھ کا نیفو شیدی، ان کرداروں میں ان دونوں متضاد علامتوں کی حسین آمیزش ہے۔ ایک طرف یہ کردار انسان پرستی، نفاست اور شائستگی سے ممیز ہیں اور ان کو پڑھ کر اس امر سے (جذباتی اور جمالیاتی سطح پر بھی) ہمیں یہ آگہی حاصل ہوتی ہے کہ ٹنڈوالہ یار سے لے کر سان فرانسسکو تک اس دھرتی کے تمام باسی ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ جس میں نسلیت، طبقہ واریت، فسطائیت اور مذہبیت کا کوئی غیرانسانی امتیاز نہیں۔ دوسری طرف سے ان ہی کرداروں میں پتھروں کی سختی اور بھاری پن بھی ہے۔ شاید وہ اسی لئے اب تک صدیوں کی نسل کشی، ظلم، زیادتی اور استحصال کے باوجود بھی اپنی شناخت کے ساتھ اپنے وجود کو کسی حد تک برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اور ہمیں وہ اب بھی چٹانوں کی طرح مضبوط اور ناقابل تسخیر نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان میں ابھی اپنی روایت، ثقافت، زبان اور تاریخ کی شناخت باقی رکھنے کا اور سفید فام سامراجیوں اور استحصالیوں سے انتقام لینے کا بے پناہ جذبہ موجزن ہے۔

اس کتاب کے مضامین کے لئے زیادہ تر مواد مصنف نے امریکہ اور کینڈا کے سفر کے دوران حاصل کیا تھا لیکن ان مضامین کی اہمیت صرف یہی نہیں کہ مصنف کے

سفرنامے پر مشتمل ہیں، بلکہ ان کی زیادہ اہمیت میرے نزدیک یہ ہے کہ اس میں ہمیں اس نام نہاد متمدن معاشرے کے ان مظلوم، کچلے ہوئے اور استحصال زدہ عوام کی المناک اور خون سے رنگی ہوئی تاریخ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، جو اس خطہ زمین کے بیشتر ممالک میں اب بھی خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ یا پھر وہ شہروں کی کچی اور غلیظ آبادیوں (ہارلیم جیسی Ghettos) میں جانوروں کی طرح زندہ رہنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی صدیوں تک نسل کشی کی جاتی رہی ہے اور ان میں سے جو بچ رہے ہیں، ان کو اب بھی عام انسانوں کے سے حقوق حاصل نہیں۔ ان میں حبشی، ریڈانڈین، جپسی اور دراوڑی نسل کے لوگ شامل ہیں۔ میں ایک بار پھر اس نقطے پر زور دوں گا کہ ان مضامین کی اہمیت اور حیثیت صرف ایک سفرنامے ہی کی نہیں بلکہ اس کا تعلق تاریخ سے بھی ہے (لیکن کون سی تاریخ؟) اس حقیقی اور مستند تاریخ سے جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ وہ تاریخ جو ابھی تک مربوط طریقے سے لکھی ہی نہیں گئی (یہ اور بات ہے کہ اس کی جھلکیاں گاہے گاہے ہمیں ترقی پسند اور فنون لطیفہ کی علامتوں کی شکل میں یا انسان پرست نقادوں اور مورخوں کی تحریروں میں نظر آتی رہیں ہیں)۔ کیونکہ اب تک جو تاریخ لکھی جاتی رہی ہے (اور جسے خواندہ طبقہ بھی مستند سمجھتا ہے) اس میں حقائق کو مسخ اور توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور سفید فام نوآبادکار سامراجی، نوکرشاہی یا پھر سرکاری درباری مورخین نے اپنے سیاسی و معاشی مفادات کے پیش نظر اسے مرتب کیا ہے۔

مصنف اپنے ان جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے تاریخ پر سے جھوٹ فریب اور مکاری کا ملمع اتارنے کی کوشش کرتا ہے اور تاریخ کے فراموش کردہ حقیقی خدوخال کو (ادبی چاشنی کے ساتھ) نمایاں کرنے میں زور قلم صرف کرتا ہے۔

ان مضامین میں سفرنامے کی دلچسپی اور گھلاوٹ بھی ہے، ادب کی مٹھاس اور چاشنی بھی ہے اور مستند تاریخ کا بھرپور علم اور شناسائی بھی۔ ہم مصنف کے ساتھ کینڈا اور امریکہ کے سفر میں شریک ہوتے ہیں لیکن اس طرح کہ وہاں کے گوناگوں کردار، وہاں کی کلبوں، ہوٹلوں اور ہارلیم جیسی جگہوں سے جمالیاتی طور پر لطف اندوز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم وہاں کے کچلے ہوئے اور دبے ہوئے باشندوں کی گفتگو اور

بحث کے ذریعے نظروں سے اوجھل مستند تاریخ کا کسی حد تک وجدان و بصیرت حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ گویا یہ سفرنامہ صرف سفرنامہ ہی نہیں بلکہ ادب و تاریخ کا ایک حسین امتزاج بھی ہے۔ جس میں ہم تہذیب کے ان فراموش کردہ کرداروں سے متعارف ہو کر انسان پرستی کے ہمدردانہ جذبات سے آشنا ہوتے ہیں اور ہمیں انڈو پاکستان سے لے کر امریکہ اور کینڈا تک پھیلے ہوئے دراوڑ، سیاہ فام، جپسی اور ریڈانڈین لوگوں میں نسلی اور طبقاتی یکجہتی کے امر سے آگہی ہوتی ہے اور اس میں ہمیں گاہے گاہے سامراجیوں، نوآبادکاروں اور سفیدفام استحصالیوں کا مکروہ اور ناقابل نفرت چہرہ نظر آتا ہے اور پھر ہمیں اس امر کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے تمدنی معاشرے کے سپراسٹرکچر کی بنیاد ان خانہ بدوشوں اور خانمابربادوں کے خون اور پسینے پر رکھی ہے۔ (افریقہ کے سیاہ فام کس طرح غلام بناکر امریکہ لائے گئے تھے اور امریکہ کے تہذیبی اور معاشرتی ارتقا میں انہوں نے کیا کردار ادا کیا تھا۔ یہ کچھ زیادہ پرانی تاریخ نہیں ہے)

پروفیسر فرید شیخ

استاد شعبہ فلسفہ

سندھ یونیورسٹی

مارچ ۱۹۹۶ء

(ا)

فیصلہ

ایک بار پہلے بھی کہیں میں نے لکھا تھا کہ نیویارک کے شہر کو اگر دور سے دیکھا جائے تو کانکریٹ کا گھنا سا جنگل دکھائی پڑتا ہے۔ چونکہ یہ شہر چند ایک جزیروں پر آباد ہے اس لئے ارد گرد پھیلنے کے لئے جگہ میسر نہ ہونے کی وجہ سے اوپر کی منزلوں کے ذریعہ آسمان کی طرف پھیل گیا ہے۔ اس کی اونچی اونچی عمارات گرجا گھروں کے میناروں کی طرح آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ وال اسٹریٹ (Wall Street) پر ٹریڈ سینٹر (Trade Centre) کی بلڈنگ جو غالباً دنیا میں سب سے اونچی عمارت ہے' گویا ایک چوتھائی میل ہوا میں اٹھتی چلی گئی ہے۔ ۱۹۸۷ء میں جب میں پہلے پہل اس کی چوٹی پر کھڑا تھا تو ساتھ میں کھڑے ایک امریکی نے مجھ سے بہت فخریہ انداز میں پوچھا۔ "کہو ' دنیا کی سب سے بڑی عمارت پر کھڑا ہو کر تمہیں کیسے لگا؟" نیچے کی طرف جھانک کر جہاں انسان اور کاروں کی ریل پیل کیڑے مکوڑوں کی طرح سڑکوں پر رینگتی دکھائی دیتی تھی' میں نے کہا "مجھے یوں لگتا ہے جیسے یا تو میں پاگل ہو گیا ہوں' یا میرے اطراف کی کل دنیا پاگل ہے" ظاہر ہے گورے امریکی کو میرا جواب سن کر مایوسی ہوئی اور اس نے ناک بھوں چڑھا کر اس کا مظاہرہ بھی کیا۔

میں پہلے پہل ۱۹۷۳ء میں امریکہ آیا تھا اور کوئی ایک سال تک واشنگٹن ڈی سی میں رہا۔ ان دنوں اس کی آبادی بیس کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اس وقت مجھے وائس آف امریکہ کے ریڈیو اسٹیشن پر اناؤنسر کی نوکری بھی مل رہی تھی اور وہاں رہنے کا ریزڈینٹ پرمٹ بھی۔ مگر اس کی شرائط مجھے منظور نہیں تھیں۔ یعنی گوری میم کے

ساتھ شادی بیاہ کا ڈرامہ رچانا اور اپنے ضمیر اور زندگی کا سودا کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے میں نے زیادہ وقت وہاں کے کالے پیلے غریب لوگوں کی قربت میں گزارا۔ پتہ نہیں کیوں، مجھے ہمیشہ اونچے طبقہ کے لوگوں کی بہ نسبت نچلی سطح پر جینے والے لوگوں میں گھل مل جانے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ وہ خواہ امریکی ہوں یا افریقی۔ گورے ہوں یا کالے، مجھے ان کے ساتھ رہنے میں کبھی کوئی خوف کبھی کوئی وسوسہ محسوس نہیں ہوتا۔ لوگ اپنے ملک کی اصلیت کے غماز بھی ہوتے ہیں۔

خیر، اس وقت مجھے احساس ہوا کہ امریکی معاشرہ ہاتھی کے دانتوں کی طرح ہے، یعنی کھانے کے لئے ایک اور دکھانے کے لئے دوسرے۔ اس زمانہ میں گوری نسل پرستی ابھی اپنی باقیات کے ساتھ قائم تھی۔ جس کے احساس سے میرے ذہن کو ایسا شدید جھٹکا لگا کہ میں یکلخت وہاں کی سب آسائشیں اور مواقع چھوڑ چھاڑ کر واپس پاکستان لوٹ آیا۔ جہاں غربت و افلاس بھری خانہ بدوشی میری منتظر تھی۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود اگلے ۱۳ برس تک میں نے پھر امریکہ کا رخ نہیں کیا۔

مگر، وہ کہتے ہیں نا کہ چور، چوری سے چلا جاتا ہے مگر ہیرا پھیری سے کبھی نہیں جاتا۔ اتنے برسوں بعد ایک دفعہ پھر میں Manhatten میں سینٹرل پارک ویسٹ اور ۹۴ اسٹریٹ کے نکڑ پر ایک چھوٹی سے مگر خوبصورت اپارٹمنٹ میں براجمان تھا۔ یہ جگہ میرے لڑکپن کے اسی دوست کی تھی جس کے ساتھ میں تیرہ برس پہلے واشنگٹن میں رہ چکا تھا۔ مین ہیٹن کے اس علاقہ میں رہنے کے لئے بیشتر امریکی عمر بھر خواب دیکھتے ہیں اور جو خال خال ہی شرمندہ تعبیر ہوتے ہیں۔

لاہور کا رہنے والا میرا دوست ان مٹھی بھر پاکستانیوں میں سے تھا جن کا امریکی خواب پورا ہوا۔ یعنی ان کی صفوں میں شامل ہوگیا جنہیں امریکہ میں میلینر (Millionios) کہتے ہیں۔ جوتوں کا بیوپاری تھا جس کا کہنا چاہیے کہ سر نیویارک میں، پیر برازیل میں تو دھڑ یورپی ممالک میں رہتا تھا۔

اسی لئے جب میں ۱۹۸۷ء میں یہاں پہنچا تو اس نے اپنی اپارٹمنٹ کی چابی مستقلاً مجھے دے دی تاکہ میں اس کی غیر موجودگی میں جب چاہوں آ جا سکوں۔

ہوا بھی یوں ہی۔ اب ۱۹۸۹ء میں مجھے امریکہ اور کینیڈا کے دورے پر آئے ایک

ماہ بیت رہا تھا مگر اپنے میزبان کی ابھی تک کوئی خبر نہ تھی، جب میں نیویارک پہنچا تو وہ برازیل میں تھا۔ جب میں کناڈا گیا، وہ یورپ میں تھا اور اب جب میں واپس نیویارک پہنچا تو وہ پھر برازیل میں۔ دور سے دیکھنے پر تو اس قسم کی زندگی بہت پر رومان نظر آتی ہے۔ مگر کہتے ہیں کہ امریکہ میں کروڑ پتی بننے کے لئے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، بہت بڑی روحانی قربانی دینی پڑتی ہے۔

اس سلسلہ میں لاہور ہی کے ایک اور دوست کی مثال بھی میرے سامنے تھی۔ میرے لڑکپن کے دوستوں میں وہ دوسرا پاکستانی تھا جس نے امریکہ میں تجارتی میدان میں کامیابی حاصل کی۔ مگر بالآخر امریکی معاشرے کے ذہنی دباؤ کو ایک حد سے آگے قبول نہ کرسکا اور جب میں وہاں پہنچا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان لوٹ جانے کے اسی طرح خواب دیکھ رہا تھا جس طرح ایک دن امریکہ آنے کے لئے دیکھے تھے۔ اور اس سب کچھ چھوڑ چھاڑ میں اس کی ایک عدد گوری بیوی، ایک بچہ اور بوسٹن میں ایک بڑا گھر بھی شامل تھا۔ ایسا گھر جس کو ملکیت بنانے تک عموما” یہاں لوگوں کی کام کرکے کمر ٹوٹ جاتی ہے اور وہ بوڑھے ہوکر ہی اس پر حق جتانے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے تقریبا” تمام زندگی کرائے کے اپارٹمنٹوں میں گزرتی ہے۔

امریکہ کی پہلی یاترا کے بعد مجھے پاکستان واپس آئے اب بیس برس بیت رہے تھے۔ اس عرصہ کے دوران، میں نے اپنا زیادہ تر وقت خانہ بدوشی کی سی کیفیت میں گزارا ہے۔ اور اب جب زندگی کی شام ڈھلنے کو ہے، سندھ کے دیہات میں ہندو بھیل کسانوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی بستی میں سادھوؤں کی طرح تن تنہا رہتا ہوں۔ اپنا کھانا خود پکاتا ہوں اپنے برتن خود مانجھتا ہوں اور بچوں کی طرح معصوم بھیل مجھے بے حد پیار ہی نہیں کرتے بلکہ مہاراج کا درجہ دیتے ہیں۔

پاکستانی معاشرہ، نچلی ذات کے ان ہندوؤں کے ساتھ چھوت چھات کا مظاہرہ کرتا ہے۔ میں نے اپنے گرد ان اچھوتوں کا خوبصورت دائرہ بن لیا ہے۔ اب میرے پاس وہی انسان آتے ہیں جن کو چھوت کی بیماری نہ ہو۔ ایک بار مجھ سے ایک برہمن نما مسلمان ملنے آیا۔ میں نے اس کی بہت آؤ بھگت کی اس کے لئے چائے بنائی اور ایک بھیل لڑکے دھرمیندر کو کہا کہ اسے دے آؤ۔ وہ صاحب دھرمیندر کے منہ پر بلا جھجھک

بولے۔

”تو کیا آپ ایک کافر کے ہاتھ سے مجھے چائے پلائیں گے؟“

میں نے کہا یہ تو معصوم بچہ ہے۔ اور پھر بھی اگر یہ کافر ہے، تو پھر میں تو اس سے کہیں بڑا کافر ہوں۔ لہٰذا میرے ہاتھ کی چائے بھی شاید آپ کو پلید کردے۔ وہ صاحب بغیر چائے پئے میرے گھر سے اٹھ کر چلے گئے اور پھر کبھی نہیں آئے۔ اور میں نے بھی خس کم اور جہاں پاک کے مصداق ان کا شکریہ ادا کیا۔

خیر، بات میرے امیر امریکی دوستوں کی ہو رہی تھی۔ میرے دونوں ہی لکھ پتی دوست اب کہتے ہیں کہ ۱۹۷۴ء میں امریکہ سے واپس لوٹ جانے کا فیصلہ میں نے صحیح کیا تھا۔ کیونکہ بقول ان کے، وہ اب امریکہ میں بہت ناخوش ہیں۔ مگر اتنی دیر ہو چکی ہے کہ اب واپسی کا راستہ ڈھونڈنا آسان نہیں رہا۔ اب وہ مشرق و مغرب، پرانی اور نئ، امیر اور غریب، کالی اور گوری غرضیکہ سرد و گرم دنیا کے بیچ گھڑی کی پنڈولیم کے طرح ڈولتے رہتے ہیں اور کہیں بھی ان کا جی نہیں لگتا۔ یعنی وہ اپنی صحیح جڑیں کھو چکے ہیں۔

حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، مگر ایک بات صاف ہے کہ سیاحت کے طور پر مغرب خواہ جنت سہی، مگر نقل مکانی کرکے اس میں رہنے کے لئے آخر میں یہی دوزخ ثابت ہو سکتی ہے۔ چونکہ اس کا احساس عمر کے آخری حصہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے کھوئے ہوئے لمحات کے لئے کڑھنے کے سوا ایک حساس آدمی کے پاس کچھ بھی نہیں بچ رہتا۔ یہ وقت انسان کے لئے زخم چاٹنے کا ہوتا ہے۔ جب وہ بقیہ کل زندگی کے اثاثوں کا حساب لگاتا ہے کہ کیا کھویا اور کیا پایا۔ زندگی کی ڈھلتی شام میں اگر یہ لمحات پشیمانی کا باعث بنیں تو اس سے زیادہ اذیت روح کو اور کوئی چیز نہیں پہنچا سکتی اور نہ ہی کوئی مادی دولت اس کی کا کفارہ ادا کر سکتی ہے۔

(۲)

سر آئنگس فریزر

۶ اپریل ۱۹۸۹ء کو جپسی لور سوسائٹی کی گیارھویں کانفرنس کے لئے مجھے ٹورانٹو یونیورسٹی کناڈا پہنچنا تھا، اور اس دفعہ میں نے ریل کا سفر کرنے کی ٹھانی۔ میرا دوست خالدی مجھے ۴۱ اسٹریٹ پر قائم زمین دوز "یونین اسٹیشن" تک چھوڑنے آیا۔ مغرب میں ہوائی سفر، ریل یا بس کے کرایوں میں زمین و آسمان کا فرق نہیں ہوتا۔ نیویارک سے ٹورانٹو تک کا ریل کا کرایہ ۱۴۳ ڈالر بنتا تھا۔ میں چونکہ محض ۲۰۰ ڈالر لے کر پاکستان سے نکلا تھا تو میرے دوست خالدی نے میرا ٹکٹ خریدا۔ صبح سویرے جب ریل گاڑی نیویارک کی زیرزمین اندھیری غاروں سے نکل کر ایک فولادی کیڑے کی طرح رینگتی اس کی اوپری سطح پر نمودار ہوئی تو ہمارے دونوں طرف ہری بھری خوبصورت چوڑی چکلی سرزمین اور اس پر سمندر نما بڑی بڑی جھیلیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور زمردی فصلوں سے لہلہاتے بڑے بڑے کھیت تھے جن میں انسان خال خال ہی نظر آتے تھے۔ ان کھیتوں میں کہیں کہیں کونوں میں کھڑے زمینداروں کے گودام نما مکانات گرجوں کی طرح تنہا اور اداس دکھائی پڑتے تھے۔

اتنی خوبصورت سرزمین پر بے یقینی کی اداس سی جھلک محسوس کرکے میرا ذہن ماضی کی تاریخی پرتوں کی طرف لوٹ گیا۔ آج سے محض ایک سو سال قبل اس سرزمین پر رنگا رنگ، قدیم قبائلی لوگ آباد تھے جن کو آج کی اصطلاح میں "ریڈ انڈین" کہا جاتا ہے۔ وہ قبائل بالکل اسی دھرتی کی طرح، کھلے دل، جاذب اور قدیم تاریخی ثقافت کے امین تھے۔ انہوں نے اس دھرتی کو اور اس دھرتی نے ان کو لازم و ملزوم کی حیثیت

میں وہ دیو مالائی کردار بخشتا تھا جس کے لئے یہ دھرتی آج بھی منفرد ہے۔ ان قبائلیوں کے قبیلوں اور ان کے ناموں سے اب بھی امریکہ کا چپہ چپہ منسوب ہے۔ آج بھی گورا یانکی جب تنک کر چلتا ہے تو لاشعوری حالت میں ان ہی کی لاابالی اور بدمست چال کی عکاسی کرتا ہے۔ غرضیکہ امریکیوں کی ناک میں سے نکلتی آوازوں سے لے کر عجیب و غریب رنگا رنگ ملبوسات اور مخصوص کردار کے پیچھے اب بھی ریڈ انڈین ' دیسی لوگ جھانکتے نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہزاروں سال پر محیط کسی قوم کی تہذیب و ثقافت یکلخت ختم نہیں ہوجاتی۔ بلکہ نوادر اس میں پناہ ڈھونڈ کر اور اسے اپنا کر جدید شکل میں اسے جاری و ساری رکھتے ہیں۔ کچھ خوبصورتیاں جھٹک دیتے ہیں اور اسی نسبت سے کچھ بدنمائیاں نئے معاشرے میں گھر آتی ہیں۔ اور کبھی کبھی نئے اور پرانے کی آمیزش ایک نئے حسن کو جنم دے دیتی ہے۔

خیر' فطرت کے قریب رہنے والے بیشتر لوگوں کی طرح یہ قبائلی بھی نہایت سادہ لوح' بھولے بھالے اور مہمان نواز تھے۔ دھرتی فطرت کی تھی اور وہ فطرت کے بچے تھے۔ اتنی بڑی اور وسیع سرزمین پر جہاں سب کے لئے مل بانٹ کر کھانے کے لئے اتنا کچھ تھا انہیں اس کو ذاتی ملکیت بنانے کا کبھی خیال تک نہیں آیا تھا۔ اور شاید یہی ان کی سب سے بڑی غلطی بھی تھی۔

پچھلی پانچ صدیوں میں ' یورپ کے قزاق نو آبادکاروں نے جدید اسلحہ کے بل بوتے پر یوں تو دنیا کا نقشہ ہی بدل ڈالا مگر امریکہ کے ریڈ انڈین ' قبائلیوں کی تو گویا مکمل نسل کشی کرکے اس زمین پر ہمیشہ کے لئے قبضہ جمالیا۔ اور بچے کھچے لوگوں کو جیل خانوں کی سی کیفیت میں' محدود. علاقوں میں محبوس کردیا گیا جنہیں ریزرویشن (Reservation) کہتے ہیں۔ سرکاری طور پر اب بھی تین چوتھائی زمین دیسی لوگوں سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر عملاً" نہ ہی ان کے پاس زمین بچی ہے اور نہ ہی انہیں کسی قسم کا کوئی قانونی تحفظ مہیا کیا گیا ہے۔ بلکہ اب بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کا سہارا لے کر ان کا صفایا کیا جاتا ہے۔ ریڈ انڈین لوگ آج اپنے وجود کی آخری جدوجہد میں مبتلا ہیں۔ نو آباد کار ذہنیت رکھنے والے امریکی حکمران ان کا نام و نشان تک مٹادینا چاہتے ہیں تاکہ اپنے اجداد کی مجرمانہ تاریخ و نسلی غارت گری پر پردہ ڈال کر اپنی قوم کی گھناؤنی اجتماعی

نفسیات سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

Magheles پہاڑوں کا سلسلہ نیویارک ریاست اور کناڈا کے بیچ سرحد کا کام کرتا ہے۔ پہاڑوں پر بادل چھائے ہوئے تھے اور اونچے اونچے درختوں کے جنگلات کہر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ میں جو بے آب و گیاہ ریگستان کی پیداوار ہوں، ایسے موسم میں فطری طور پر ساون بھری رومان پرور دنیا میں کھو جاتا ہوں۔ میں نے سرور کی سی کیفیت میں آنکھیں موند لیں اور ایک دفعہ پھر ریڈ انڈین لوگوں کے بیچ پہنچ گیا۔ مجھے لگا جیسے جیالے اور حسین لوگ اب بھی کھلی کی پہاڑی وادیوں میں خیمہ زن ہیں اور جنگلات سے اٹھتا کہرا نہیں بلکہ ان خانہ بدوش انڈین کے چولہوں سے اٹھتا ہوا دھواں ہے۔ جب میں نے آنکھ کھولی تو ہم نیویارک ریاست کی سرحد عبور کر کے کناڈا میں داخل ہو چکے تھے، نیاگرا فالز Niagra Falls نے ہمارا استقبال کیا۔ ریل گاڑی اب میلوں میل اونٹاریو جھیل Lake Ontaria کے ساتھ ساتھ سرپٹ شمال کی سمت دوڑتی رہی۔ ماہ اپریل کے باوجود موسم میں اب بھی خاصی خنکی تھی۔ جھیل کے کچھ حصے اب بھی برف میں ڈھکے ہوئے تھے اور جب ہم ٹورانٹو پہونچے تو ہلکی ہلکی برف باری ہونے لگی۔

یوں ٦ اپریل کی شام کو میں ٹورانٹو یونیورسٹی کی لیڈیز کلب میں جہاں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا، پہونچنے والا پہلا شخص تھا۔ مجھے کمرہ نمبر۱ میں ٹھہرایا گیا۔ رات پڑی تو ایک ایک کر کے دوسرے ممبران بھی پہنچنے لگے۔ میں چونکہ تازہ تازہ پاکستان سے آیا تھا اور یہاں کے اوقات کار کے ساتھ پاکستان کا کوئی دس گھنٹے کا فرق تھا اس لئے جب سے نیویارک پہنچا تھا ٹھیک سے سو نہیں پا رہا تھا اور دماغ بوجھل تھا۔ چونکہ اگلی صبح کانفرنس شروع ہو رہی تھی جس میں ایک مقالہ پڑھنا تھا، سوچا جلد سو جاؤں تاکہ صبح تک تازہ دم ہو سکوں۔ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک لحیم شحیم اور قد آور شخص نے اپنا تعارف کرایا۔

"میرا نام ڈاکٹر لاک ووڈ ہے اور میں میشیگن یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔ کچھ دوسرے ممبران بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں ہم پاس کی ریسٹوران میں جا رہے ہیں۔ کیا آپ آنا پسند کریں گے؟ آئیے نہ! ڈاکٹر لاک ووڈ نے اصرار کیا۔ مین چار و ناچار ان کے

ساتھ جانے پر رضامند ہوگیا' مگر میں حقیقت میں ایک شدید جیٹ لیگ (Jet Lag) کا شکار تھا اور میری ذہنی کیفیت اچھی نہیں تھی۔ جب میں تیار ہوکر کلب کے بڑے دروازے پر پہنچا تو لاک ووڈ کے ساتھ ایک اور صاحب اور دو خواتین موجود تھیں۔ تعارف ہوا۔

"مسٹر خورشید قائم خانی۔ اور یہ ہیں سر آنگن فریزر مشہور جپسولوجیسٹ' شکاگو یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ اور یہ ہیں مادام مریم کلپاراؤ' جنھوں نے اندلس کے جپسیوں پر کافی کام کیا ہے۔ ان کا تعلق نیویارک سے ہے اور یہ ہیں ان کی ساتھی مس کیتھرین"۔ رسمی علیک سلیک کے بعد ٹہلتے ہوئے ہم ریسٹوران میں جاپہنچے۔ سرِ آنگس فریز کا نام مانوسیت کے ساتھ میرے دماغ میں گھومنے لگا اور پھر مجھے یاد آیا۔

۱۹۸۷ء میں نیویارک میں قیام کے دوران ایک شام شہناز کا فون آیا جو فیض احمد فیض کی بھتیجی تھی۔ مین ہیٹن میں ہی رہتی تھی اور ایک کالج میں پڑھاتی تھی۔ شہناز کو نیویارک میں میری موجودگی کی اطلاع ہمارے ایک مشترک دوست خالد محمود نے دی جو ان دنوں نیو جرسی کے رٹگر یونیورسٹی سے منسلک تھے۔ خالد محمود کا شمار ایک زمانہ میں کراچی کے بہت ہی جیالے ترقی پسندوں میں ہوتا تھا۔ شام کو ان کی اپارٹمنٹ میں پہنچا تو وہاں شہناز کی بہن تہمینہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان سے میری پرانی شناسائی تھی ہم ایک ہی زمانہ میں ستار میں لکھا کرتے تھے۔ یہ دنیا کتنی چھوٹی ہے! میں نے سوچا۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے کے ساتھ مانوس ہوگئے۔

فیض احمد فیض کے خاندان کے ناطے یہ خواتین خاصی ترقی پسند اور باعمل تھیں۔ بڑی دلچسپ گفتگو رہی۔ شہناز نے سندھ کے بارے میں بہت سے سوال اٹھائے اور سندھ کا دورہ کرنے کی خواہش بھی ظاہر کی۔ جب شہناز کو پتہ چلا کہ میرے مصنوعات اکثر اوقات خانہ بدوشوں اور دیگر بھٹکتی نسلوں کے بارے میں ہوتے ہیں تو گفتگو جپسیوں کے بارے میں چل نکلی' جن میں شہناز کو بھی خاصی دلچسپی تھی۔ اس دوران اس نے اپنے ریکارڈ پلییر پر فلیمنکو موسیقی کے کچھ ریکارڈ بھی سنوائے۔ آخر میں کھانے پینے کی لذیذ ضیافت کے بعد اس نے جپسیوں کے بارے میں ایک کتاب "تحفتا" دی جس کا نام تھا جپسی دھرتی کے جہاں گرد' جو بارٹ میکڈیل کی لکھی ہوئی تھی جس

میں ریفرنس کے طور پر سر آ نگس فریزر کا نام بار بار آتا تھا۔ اور اب محض اس واقعہ کے دو سال بعد میں ٹورانٹو یونیورسٹی کے ایک ریسٹوران میں سر آ نگس فریزر کے مہمان کے طور پر ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یوں تو زندگی حادثات و اتفاقات کا ہی نام ہے‘ مگر میری زندگی میں کچھ حسین اتفاقات اس نوعیت سے رونما ہوتے ہیں کہ میں کبھی کبھی اپنے آپ پر شک کرنے لگتا ہوں۔

(۳)

بہن فرانسیسکہ

Gypsy Lore Society، جپسی لور سوسائٹی کی تین روزہ بین الاقوامی کانفرنس میں میرا موضوع The Roots of Gypsy Diaspora یعنی جپسیوں کے بکھر جانے کی بنیادیں، چونکہ عام موضوعات سے ہٹ کر تھا اس لئے کافی سراہا گیا۔

کانفرنس کے بعد میری ملاقات Eva Michelle نام کی ایک جپسی خاتون سے ہوئی جس کا تعلق خانہ بدوشوں کے ایک لوہار قبیلے سے تھا۔ اور شکل و صورت سے بھی [illegible] بالکل ہندو پاک کے گاڑیہ لوہار عورتوں سے ملتی جلتی ہی تھی۔ جب میں نے اسے یہ حقیقت بتلائی تو [illegible] بہت خوش ہوئی اور یگانگت کا احساس دلاتے ہوئے فر فر مجھ سے رومنی زبان میں گفتگو کرنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ہندوستانی زبان ہی میں بول رہی ہے۔ مگر شکریہ کے علاوہ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے مجھ سے فرمائش کی کہ جب میں ملک واپس جاؤں تو تحفہ کے طور پر اسے ہاتھوں کے کنگن، گلے کا چندن ہار اور چندری وغیرہ ضرور بھیجوں۔ میں نے ہاں تو کی مگر ہم دونوں ہی کو احساس تھا کہ یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔ اس لئے کہ خانہ بدوش جون بدلنے والے سانپ کی طرح یکسر غائب ہوجانے کے عادی ہوتے ہیں۔

اس وقت مریم کلپاراؤ اور کیتھرین نے مجھے ٹورانٹو ٹاور کی سیر کرائی جو غالباً اس وقت نیویارک کے ٹریڈ سینٹر کی عمارت کے بعد دنیا کی دوسری سب سے اونچی عمارت تھی۔ تین دن پلک جھپکتے میں گزر گئے اور کانفرنس ختم ہوگئی۔ اس کے بعد مجھے مانٹریال جانا تھا، جہاں میرا منہ بولا بھائی سیم نیوموف اور بہن فرانسیسکہ رہتے تھے۔ مانٹریال

روانگی سے ایک دن قبل کنگسٹن نام کے ایک قریبی شہر سے پروفیسر جمیل رشید نے ٹیلیفون کیا اور انہوں نے وہاں آنے کی دعوت دی۔ ایک سال قبل جب جمیل رشید پاکستان آئے تو ڈاکٹر مبارک علی کے گھر حیدر آباد میں ان سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔ کنگسٹن کا شہر ٹورانٹو اور مونٹریال کے درمیان واقع ہے۔ جمیل رشید ان دونوں وہاں کی "Queen s University" کوئینز یونیورسٹی میں پولیٹیکل اکانومی پڑھاتے تھے۔ لہٰذا ریل کے سفر کے دوران راستے میں ٹھہر گیا۔ جمیل رشید دلچسپ آدمی تھے۔ شہر اور یونیورسٹی کی خوب سیر کرائی۔ ایک زمانہ میں یہ شہر لوئر کناڈا کا دارالخلافہ تھا۔ اور اب بہت ساری بڑی بڑی جیلوں کے لئے مشہور تھا۔

مانٹریال میں ۱۹۸۷ء میں بھی جا چکا تھا جہاں مجھے میگل یونیورسٹی میں پاکستان کی سیاسی حالت پر لیکچر دینے کو کہا گیا تھا۔ اب جب وہاں پہنچا تو ریلوے اسٹیشن پر بھائی سیم نیوموف کو منتظر پایا۔ سیم اور فرانسیسکہ مانٹریال کے مضافات میں چیتوگوئے Chateauguey نام کی ایک خوبصورت بستی میں رہتے تھے؛ جہاں ان کا اپنا گھر تھا۔ اور یہ میں بتلاتا چلوں کہ امریکہ اور کناڈا میں بہت تھوڑے لوگوں کے اپنے ذاتی گھر ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ چھوٹے چھوٹے اپارٹمنٹ نما کرائے کے گھروندوں میں رہتے ہیں۔

جب ہم گھر کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں سیم نے کونل باسو اور شسمتا نام کے ایک بنگالی جوڑے کو بھی ساتھ لے لیا۔ یہ لوگ کلکتہ کے رہنے والے تھے اور میگل یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہیں پڑھانے لگے تھے۔ کونل باسو کا تعلق بنگال کے ایک مہذب، روشن خیال سوشلسٹ گھرانے سے تھا۔ اور وہ بہت جاذب شخصیت کا حامل تھا۔ اس سے مل کر مجھے کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی جیسے ہم طویل عرصہ سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ شسمتا شانتی نکیتن کی فارغ التحصیل تھی اور دیکھنے میں شرمیلا ٹیگور لگتی تھی۔ شام ہو رہی تھی، گھر پہنچے تو بہن فرانسیسکہ نے لپٹ کر والہانہ استقبال کیا۔ "تم کیسے ہو؟ سفر کیسا تھا؟ اور ہاں تمہارا لیکچر کیسا رہا؟" فرانسیسکہ نے ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوال کر ڈالے اور جلدی سے میرے لئے کافی بنانے لگی۔ اسے پتہ تھا کہ مجھے کافی پینے کی کتنی لت ہے۔

بہن فرانسیسکہ اور بھائی نیوموف مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے اور ہمارے اس روحانی رشتہ کا ایک طویل پس منظر تھا۔

فرانسیسکہ دوسری عالمی جنگ سے قبل ہنگری کے ا۔ستراژی نام کے آخری شاہی خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ فرانسیسکہ کی بڑی بہن گلوریا کا شمار یورپ کی حسین ترین اور ذہین ترین ادیباؤں میں ہوتا تھا۔ دونوں بہنوں کی اعلیٰ تعلیم فرانس کی سوربون یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ اور ایک وقت مشہور ادیب البرٹ کامو اور گلوریا کا بڑا رشک آور جوڑ تھا۔

پھر یکلخت جرمن نازیوں کے گھناؤنے بادل دوسری عالمی جنگ کی صورت میں مشرقی مغربی یورپ پر منڈلانے لگے۔ جواں سال گلوریا، کامو اور سارترے جیسے ادیبوں کی نسل نے نازیوں کے خلاف پارٹیزنز مزاحمتی جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ یورپ کی اس نوجوان نسل نے نہ صرف جرمن، نازی قوم پرستوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ بڑے ظلم و ستم بھی جھیلے، جن کا تعلق زیادہ تر ترقی پسند نظریاتی تحریکوں سے تھا۔ فرانسیسکہ بھی اپنی مہم جو بڑی بہن کا ساتھ دیتی رہی۔ بل آخر نازی قوم پرستوں نے انہیں گرفتار کرکے بدنام زمانہ جنگی قید خانوں، جنہیں **Concentration Camps** کہتے تھے محبوس کردیا۔ فرانسیسکہ کی عمر اس وقت کوئی آٹھ برس کی تھی۔

ان قید خانوں میں اس قدر ظلم کیا جاتا، کہ آج فرانسیسکہ کے بدن کا کوئی حصہ شاید ہی سلامت ہو۔ رائفل کے دستوں کے ساتھ اس کے دانت، جبڑے، کھوپڑی، پسلیاں اور دوسرے عضو توڑ دیئے گئے۔ فرانسیسکہ بنیادی طور پر مزاحمت پرست تھی اور اس نے ننھی عمر میں تین دفعہ ان قصاب خانوں سے فرار ہونے کی کوشش کی، مگر تیسری بار گرفتار ہونے پر اس کے پیروں کے دونوں پنجے کچل دیئے گئے۔ وہ کوئی چار سال تک ان جنگی کیمپوں میں مقید رہی۔ جنگ کے خاتمہ پر جب نیوریم "برگ ٹرائل" کے نام سے جنگی جرائم پر ایک خصوصی جیوری قائم ہوئی تو بین الاقوامی ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے یہ معلوم کرنے کے لئے تحقیق کی کہ اتنی اذیتوں کے باوجود زندہ کیسے بچ رہی۔ ان کے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانسیسکہ نے ان قید خانوں میں انتہائی تشدد کا مقابلہ شدید مزاحمت کے ساتھ کیا تھا۔

اب بھی فرانسیسکہ کے ذہن پر اس وحشت ناک دور کا اثر باقی ہے اور کبھی کبھی مایوسی، تنہائی، بے چارگی اور غیر تحفظ پن کا احساس اس کے لاشعور کو آگھیرتا ہے۔ وہ اس دور کے بارے میں کبھی کچھ سوچنا نہیں چاہتی۔ بلکہ اسے بھلانے کے لئے ہر وقت یا تو بھاگ دوڑ اور ورزشی مشاغل میں ڈوبی رہتی ہے اور یا پھر پڑھنے لکھنے اور گھر کے کام کاج میں مصروف۔ بے ساختہ ہنسی مزاق اور ٹھٹھوں کی عادت بھی، جو اب اس کا خاصہ ہے، گھناؤنے ماضی سے دور رہنے کی کوشش ہی ہے۔ وہ مہینے میں دو ایک طویل خط مجھے ضرور لکھتی ہے اور میں بھی اسی باقاعدگی سے اسے جواب دیتا ہوں اور اگر کبھی وقت پر جواب دینے میں دیر ہوجائے تو فرانسیسکہ اور سیم دونوں پریشان ہوجاتے ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ بھائی بہن کا یہ روحانی رشتہ کیسے استوار ہوا۔

۱۹۸۳ء میں سیم نیوموف اور فرانسیسکہ، چین اور ہند چینی کے دیگر ممالک کے دورہ کے بعد لاہور آئے اور وہاں ہماری ایک مشترکہ دوست خدیجہ گوہر کے مہمان ہوئے۔ ڈاکٹر سیم نیوموف، مانٹریال کی میکگل یونیورسٹی میں خدیجہ کی بیٹی فریال گوہر کے استاد رہ چکے تھے اور اسی حوالہ سے شناسائی پیدا ہوئی تھی۔ خدیجہ نے مجھے ان سے ملانے کے لئے سندھ سے بلا بھیجا۔ ہماری ملاقات ہوئی تو لگا بس ہم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ مجھ سے انہوں نے بہت سے سوال کئے۔ میں بالخصوص اس زمانہ میں اپنے اطراف کے ماحول سے سخت ناراض رہتا، اور بات کرتے وقت اتنا جذباتی ہوجاتا کہ کبھی کبھی غصہ کی کیفیت میں منہ سے جھاگ ابل پڑتے۔ سامراجیوں اور ان کے پالتو زمیندار، فوجی اور نوکر شاہی حکمرانوں کے نام سے تو میرا خون کھولنے لگتا۔ مجھے یاد ہے، اس دن بحث کے دوران جب میں نے کہا۔

”ہماری ثقافت؟ انگریز نو آبادکاروں نے اپنے تین سو سالہ دور حکومت میں ہماری ثقافت، ہماری تاریخ، ہماری معیشت، ہماری تہذیب غرضیکہ ہماری اجتماعی روح اور قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرکے پہلے ہمیں ننگا اور بھوکا کیا اور پھر ملک کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرکے ہمیں کتوں کی طرح آپس میں لڑا کر چلے گئے اور ان کی بل واسطہ یا بلاواسطہ اقتصادی لوٹ کھسوٹ تو اب بھی جاری ہے، مگر ہم آدھی صدی بیت جانے کے بعد آج بھی آپس میں لہولہان ہیں۔ یہ ہے ہماری ثقافت! ——————“ بات ابھی ختم

نہیں ہوئی تھی کہ فرانسیسکہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اور خدیجہ سے کہنے لگی۔ ''بہن! میں خورشید کو اپنا بھائی بنانا چاہتی ہوں۔ میرا سیم نیوموف کے بعد اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ سب عزیزو اقارب نازی جرمنوں کے ہاتھوں مارے گئے۔'' خدیجہ گوہر پہلے تو ہنسیں اور پھر فرانسیسکہ کی سنجیدگی کا احساس کرتے ہوئے ازراہ مزاق کہا۔

''فرانسیسکہ' یہ تو بڑا آسان ہے۔ خورشید کا تعلق راجستھانی راجپوتوں سے ہے۔ ان کی ایک قدیم رسم کے مطابق اگر تم اس کے ہاتھ پر راکھی بندھن کا دھاگا باندھ دو' تو یہ ہمیشہ کے لئے تمہارا رکھوالہ بھائی بن جائے گا۔''

فرانسیسکہ نے لپک کر سامان ٹٹولا اور پھر ایک کالا ریشمی دھاگا لاکر میری کلائی پر باندھ دیا۔

''خورشید' یہ کبھی مت بھولنا کہ کناڈا میں تمہاری بہن رہتی ہے اور میں جہاں کہیں بھی ہوں گی' اپنے بھائی کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

تو گویا' یہ تھی ہمارے بھائی بہن کے رشتہ کی ابتدا۔ میں کوئی پندرہ دن مانٹریال میں رہا۔ اس دوران فرانسیسکہ اور بھائی نیوموف نے میری خاطر مدارت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ بھی امریکہ اور کناڈا کے ایسے ٹوٹے پھوٹے معاشرے میں جہاں سن بلوغت کے بعد نہ باپ' بیٹے کا ہوتا ہے اور نہ بیٹی' ماں کی اور بھائی بہن کے رشتہ کا تو ذکر ہی کیا۔

وہ روزانہ صبح سویرے میرے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھوتی' بازار سے روزانہ کچھ نہ کچھ خرید کر تحفہ' تحائف کے طور پر مجھے پیش کرتی۔ اور نیوموف تو اس سے بھی ایک قدم آگے تھا۔ انہوں نے مجھے اتنا پیار دیا ہے کہ شاید میں اسے کبھی لوٹا نہ پاؤں گا۔

(۴)

میزبان

مانٹریال سے نیویارک واپسی کا سفر میں نے گرے ہاؤنڈ بس سے کیا۔ ایک بار پھر، “نیاگرا فالز” کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ماضی کے اوقات میں ہلکی سی ڈبکی لگائی۔ میں آنکھیں موندتے ہی پلک جھپکتے میں اپنے بچپن کی ایک حسین یاد میں کھوگیا۔ ٹھیک چالیس برس پہلے میں نے “مارلن مانرو” کی انگریزی فلم دیکھی تھی، جس کا نام تھا “نیاگرا فالز” اس فلم کا صوتی اثر اب بھی ذہن پر اسی طرح باقی تھا، جیسے کل کی بات ہو۔

اس کے کچھ دیر بعد ہماری بس امریکی سرحد پر آکر رک گئی۔ اور ہم سب قطار میں اپنے پاسپورٹ لے کر کسٹم والوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ ہمارے ساتھ زیادہ تر سیاہ فام امریکی اور تھوڑے بہت گورے لوگ تھے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ سب مسافروں کو بس میں لوٹ جانے کی اجازت مل گئی مگر مجھے اور ایک West Indian یعنی غریب الہند کے مسافر کو کہا گیا کہ اپنا سامان لا کر چیک کروائیں۔ پوری بس میں شاید میں نے سب سے زیادہ صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور میرا ویسٹ انڈین ہمسفر بھی معمر اور وضع دار آدمی تھا۔ ہم دونوں اپنے تھیلے، سوٹ کیس وغیرہ گھسیٹ کر وہاں لائے۔ میں کچھ حساس طبیعت واقع ہوا ہوں۔ یہ جان کر کے کہ یہ محض ہمارے پاسپورٹوں کی برکت تھی، مجھے بہت دکھ ہوا۔ یعنی میں پاکی، تھا اور اس حوالے سے ایک غالباً” اسمگلر۔ سامان چیک کرنے کے بعد، کسٹم آفیسر نے میرے پاسپورٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔ “آپ نے کناڈا میں اوور سٹے، Overstay کیا ہے۔

Overstay! میں نے کہا میں تو محض پندرہ دن کے بعد لوٹ رہا ہوں جبکہ میرا ویزا چار ماہ کا تھا اور یہ بات ایک امریکی سرحد والے نے کہی، جب کہ میرے پاسپورٹ پر چار سال کا امریکی ملٹی پل ویزا، Multiple Visa لگا تھا۔ اصل میں اس نے غالباً میرا حلیہ دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ ایک پاکستانی اور اتنی سج دھج کے ساتھ، ضرور کوئی سمگلر ہوگا۔ میرا خون کھولنے لگا۔

"تم امریکی، احسان فراموش ہی نہیں، سخت جاہل بھی ہو۔ تم نے پاکستان کو تقریباً ایک امریکی ریاست ہی بنا رکھا ہے اور ہماری ہر حکومت تو گویا آدھی صدی سے تمہاری لونڈی ہے۔ اس کے باوجود ایک امریکی کی نظروں میں ایک پاکستانی پاسپورٹ کے ساتھ یہ سلوک میری سمجھ سے بالا ہے۔ وطن جاکر میں بھی تمہارے لوگوں سے حساب کتاب کروں گا۔ میرے منہ سے جھاگ چھوٹنے لگے اور میرا ویسٹ انڈین ہم سفر بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ مجھے یوں گھورنے لگا، جیسے میں اس امریکی سے اس کا بدلہ بھی لے رہا تھا۔ اتنے میں ایک اور کسٹم والا میرا شور شرابا سن کر وہاں آیا اور میرے پاسپورٹ کے ویزا کو ایک نظر دیکھ کر مجھ سے معافی مانگنے لگا۔

"معاف کیجئے۔ یہ آدمی نیا ہے۔ انڈر ٹریننگ ہے۔ آپ کو بہت زحمت ہوئی، آپ جاسکتے ہیں۔ شکریہ"

جب میں اور ویسٹ انڈین مسافر دوبارہ بس میں داخل ہوئے تو سب مسافروں نے ہمیں یوں گھورا جیسے ہم کسی جیل سے چھوٹ کر آنے والے مجرم تھے۔ میں ندامت کے مارے اپنی نظریں نیچی کرتے ہوئے، دبک کر اپنی سیٹ میں دھنس گیا اور بس چل دی۔

جب ہم نیویارک پہونچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے میں اپنا سوٹ کیس گھسیٹتا جب بڑے یونین اسٹیشن سے باہر آیا تو وہاں بہت سے افریقی نزاد نوجوان نہایت کسمپرسی کی حالت میں کھڑے میرا سامان اٹھانے کے لئے میری طرف لپکے۔ میں بچپن ہی سے سندھ میں افریقی نزاد شیدیوں کے ساتھ پل کر بڑا ہوا ہوں۔ اس لئے مجھے ان کے ساتھ ہمیشہ ہمدری اور یگانگت کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے ان سے کبھی خوف نہیں

آنا۔ جس کے لئے لوگ انہیں اتنا بدنام کرتے ہیں۔

”صرف ایک ڈالر، ٹیکسی تک چھوڑ آؤں گا۔“ ایک شیدی بچے نے گڑگڑا کر اور میرا جواب سنے بغیر میرا سامان اٹھالیا۔ اور میں بھی مسکراتا ہوا اطمینان سے اس کے پیچھے چلتا زمین دوز اسٹیشن سے باہر سڑک پر آگیا۔ اتنے میں ایک ٹیکسی تیزی سے یوں موڑ کاٹتے ہوئے جیسے جیمزبونڈ، کی فلموں میں اکثر نظر آتا ہے، میرے سامنے آکر رکی اور آدھی انگریزی اور آدھی پنجابی میں چلا کر کہا۔

”پاہ جی، India؟ ہوشیار، پلیز، اے لوگ نیگرو بہت خطرناک، چور، ڈاکو پلیز۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھو۔“ اور اس نے اسی تیزی سے باہر نکل کر شیدی لڑکے کے ہاتھ سے میرا سوٹ کیس تقریبا“ چھینتے ہوئے اپنی گاڑی میں رکھا۔ میں نے اس ہڑبھراہٹ میں شیدی لڑکے کو ایک کی بجائے دو ڈالر کے نوٹ دیئے اور ٹیکسی ڈرائیور اب شانت سے ٹیکسی چلاتے ہوئے میرا پتہ پوچھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”پاہ جی، کہاں کے ہو؟ ہندوستان؟“ اس نے اثبات سے سرہلایا اور کہا ”دلی، آپ بھی دلی کے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بس یونہی سمجھ لو“ میں نے کہا ”آپ کا اندازہ بہت غلط نہیں ہے۔ مگر یہ بتلاؤ تم رات بھر ان سڑکوں پر ٹیکسی چلاتے ہو اور بقول تمہارے یہ خطرناک کالے لوگ تمہیں کچھ نہیں کہتے۔ تو پھر اس ڈرامہ بازی اور کالوں کے بارے میں اتنی گھٹیا رائے زنی کی کیا ضرورت تھی؟“ بیچارے میرے ہم وطن کو جب پتہ لگا کہ میں پاکستانی ہوں تو کھسیانہ سا ہوا اور اب پاکستانیوں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ اس کے اجداد پاکستانی پنجاب سے نقل مکانی کرکے ہندوستان پنجاب میں جابسے تھے۔ اور قارئین اب وہ اپنے جنم دیس کے لئے اتنا پردیسی تھا جتنا میں۔ مگر کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ہندوستانی ہوں یا پاکستانی گوروں سے کہیں زیادہ نسل پرست ہیں۔

27W, 94th St، میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو راستہ بتلایا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہاں پہونچ کر اپارٹمنٹ نمبر۔۹ کا دروازہ کھولا تو ادھر ادھر بکھرا سامان دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس بار میرا میزبان برازیل یا یورپ سے لوٹ آیا ہے اور نیویارک ہی میں ہے۔ میں نے Avenue of America پر قائم اس کے دفتر میں فون کرکے اس سے علیک

سلیک کی اور اپنے لوٹ آنے کی اطلاع دی۔ اس نے جلد لوٹ آنے کا وعدہ کیا اور کہا "کھانا باہر کھائیں گے۔ اور ہاں میرے آنے تک سونا نہیں' تم رات کو جلد سوجانے کی عادی ہو۔" اس نے تاکید کی۔

رات کو دیر سے اس کا فون آیا۔ اس کی آواز بوجھل اور گھمبیر سنائی دی۔

"خورشید' ایسا کرو کہ پاس ہی Amsterdam Av پر Under the Stair نام کی ایک چھوٹی سی ریستوران نما Pub پب ہے' دیکھی ہے نہ؟ بس وہاں پہونچ جاؤ۔" اور اس نے فون بند کردیا۔

میں بن ٹھن کر جب وہاں پہونچا تو وہ وہاں موجود تھا۔ اعلیٰ امریکی انداز میں خاطر مدارت ہوئی۔ خوب کھایا پیا اور پھر کچھ غم جاناں اور غم دوراں کا ذکر چلتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ جذباتی انداز میں پرانے قصے چھیڑ بیٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ امریکہ میں شدید دباؤ اور تناؤ توڑنے کے لئے کبھی کبھی یہ ضروری ہوتا ہے۔

"خورشید' تم نے زندگی میں بہت مار کھائی ہے اور وہ بھی دیدہ دانستہ۔ مگر جو چیز مجھے اچھی لگتی ہے' وہ یہ ہے کہ تم چلاتے کبھی نہیں۔ تم نے وہی کیا جو تمہیں اچھا لگا' خواہ اس کی کتنی ہی مہنگی قیمت کیوں نہ چکانی پڑی۔ تمہیں زندگی میں سب کچھ میسر ہوتے ہوئے بھی تم نے سب کچھ ٹھکرادیا۔ تم نے ایک خبطی' انقلابی بننا پسند کیا۔ بھاڑ بھاڑ کی دھول جھونکی۔ خانہ بدوشوں کی طرح در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ مگر یہ تمہاری پسند کی زندگی تھی اور اب بھی ہے۔ جب ۱۹۷۳-۷۴ میں ہم واشنگٹن ڈی سی میں رہتے تھے تو تم اچانک واپس لوٹ گئے تھے۔ اس پر ہماری لے دے بھی ہوئی تھی۔ مجھے پتہ تھا' تم کہاں جارہے ہو........." اس نے کچھ دیر میری آنکھوں میں گھورا اور پھر کہا۔

"مجھے سب سے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ تم نے نہ ہی تو زندگی سے مصالحت کی' نہ ٹوٹے اور نہ جھکے۔ میں اپنے سال بھر کے بیوپار کے سلسلہ میں کوئی بارہ لاکھ ڈالر محض سفر پر خرچ کرتا ہوں۔ میرے لئے تمہیں ایک غیرملکی سفر کے لئے ٹکٹ بھیجنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ تم بہت خوددار آدمی ہو اور میری اس قسم کی حرکت پر خفگی کا اظہار کروگے۔

"ویسے تم جانتے ہو' میں نے بھی ساری عمر پاگلوں کی طرح کام کیا ہے۔ اور تمہیں ۱۹۷۳ء کا تجربہ ہے کہ اس ملک میں پیسہ کمانا کتنا مشکل کام ہے۔ امریکی سسٹم تو ایک ایک دھیلے کی پوری قیمت خون پسینہ نچوڑ کر وصول کرتا ہے۔" وہ ہاتھوں میں سر تھام کر میز پر جھک گیا۔

"یار کبھی کبھی تھک جاتا ہوں اور ایسے میں جی چاہتا ہے کہ کہیں دور' بہت دور نکل جاؤں۔ ہاں بالکل تمہاری طرح۔ میری زندگی میں بھی ایک بہت گہرا خلاء ہے بھرنے کو نہیں آتا۔ اگر برا نہ مانوں تو ایک تجویز پیش کروں....." آج وہ دل کی گہرائیوں سے بول رہا تھا۔ اور چوں کہ ایسا بہت کم ہی ہوتا تھا' اس لئے میں نے چاہا کہ بس وہ بولتا رہے۔

"ہاں' ہاں کیوں نہیں کہو......" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"کیا تمہارے پاسپورٹ پر اٹلی' فرانس اور لندن کا ویزہ لگا ہے؟" بالکل نہیں میں نے کہا" اپنے منہ تو میں تو اس کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تو کوئی بات نہیں۔ میری کمپنی کا سفارت خانوں پر بڑا اثر و رسوخ ہے۔ اور بندوبست ہو جائے گا۔ چلو اس ہفتہ' ان ممالک کی سیر تفریح کو چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے تم اٹلی پہونچ کر نیویارک کو بھول جاؤ گے۔"

"کیا"؟ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی اور میری زبان لکنت کھا گئی اتنے میں ارجنٹائن کی ایک خوبرو خاتون جو ہمیں کھلا پلا رہی تھی' آئی اور ہمیں دیکھ کر نہایت اپنائیت کے ساتھ مسکرانے لگی۔

"اور کچھ"؟

"نہیں' بل لے آؤ" میرے دوست نے کہا

"آپ پاکستان کے ہیں نہ؟ بالکل ہمارے لوگوں کی طرح۔" وہ اٹھلاتی' مسکراتی اور لجاتی ہوئی ٹھمک ٹھمک کر بل لینے چلی گئی۔

جب ہم باہر نکلے تو سڑک پر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی اور دور' اونچی اونچی روشن عمارتوں سے کہیں پرے افق پر نئی صبح پھوٹنے کو تھی۔

(۵)

ھارلیم

نیویارک میں ھارلیم کالے، پیلے غریب لوگوں کی سب سے بڑی بستی ہے۔ بالکل ایسی جن کو ہم اپنے علاقوں میں کچی آبادی کہتے ہیں۔ اس کی آبادی اس زمانہ میں کوئی تین ملین کے لگ بھگ ہوگی۔ ھارلیم، جرائم اور لوٹ مار کے لئے دنیا بھر میں بدنام ہے۔ اگر آپ نیویارک میں نووارد ہوں تو آپ لوگوں کو اکثر یہ کہہ کر خبردار کرتے ہوئے سنیں گے۔

"ھارلیم کے قریب مت جانا، وہاں کے کالے بہت خطرناک لوگ ہیں۔" مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں جو افریقی شیدیوں کے ساتھ، ٹنڈو الہ یار میں بچپن ہی سے کبڈی اور فٹ بال کھیلتا جوان ہوا، کالے لوگوں کے بارے میں اس قسم کے تعصّبات یا میتھ پر کبھی کان نہیں دھرتا۔ دراصل حقیقت، میتھ سے بالکل الٹی تھی۔

ھارلم کے متعلق زیادہ افواہیں گوری نسل پرستی کے تعصّبات اور واہموں کی اختراع تھیں اور جن کو امریکی میڈیا خوب اچھالتا تھا۔ کالے لوگ یہاں اپنے اصل رنگ و روپ میں رواں دواں نظر آتے تھے۔ امریکہ کے بیشتر نامور موسیقار اور اتھلیٹ بھی اس بستی کی پیداوار تھے۔ ھارلم کی بستی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے پر یوں لگتا تھا جیسے امریکی ہوائی فوج کے طیاروں نے ابھی ابھی بمباری کرکے اس کو تباہ کیا ہو۔ جھلسی ہوئی بھوری اینٹوں کی عمارتیں، ٹوٹے پھوٹے دروازے اور کھڑکیاں، تنگ و تاریک گلیاں اور غلاظت کے ڈھیر۔ ننگ دھڑنگ اور ننگے پیر سڑکوں پر دوڑتے کالے بچے۔ رنگ برنگ اور بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، مغرب اور مشرق کے بیچ ٹوٹی

پھوٹی نسل و ثقافت کی باقیات۔ غرضیکہ وہاں کی سخت عجیب و غریب زندگی جس میں انسان سسک سسک کر جیتا نظر آتا تھا دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

گو ۱۹۷۳ء کے امریکہ کے مقابلہ میں اب وہاں حالات خاصے بدل چکے تھے۔ اس زمانہ میں کالے لوگ نچلے طبقے کے طور پر محض ہارلم کی طرز کی Ghettos گھیٹو اور Slums' سلمز ہی میں رہتے تھے جبکہ بالائی اور درمیانہ طبقہ کے گورے لوگ اونچی اونچی عمارتوں اور صاف ستھری بستیوں میں! چونکہ دونوں پرتوں میں نسلی امتیاز اور اقتصادی اور سماجی ناہمواری صاف نظر آتی تھی' اس لئے کالے لوگوں کا غم و غصہ مخاصمتی کشمکش اور بہتر سلوک و حقوق کی جدوجہد ایک فطری بات تھی۔

مگر اب کالے لوگوں کا بھی ایک اپنا درمیانہ طبقہ جنم لے چکا تھا۔ اور یہ طبقہ اب غریب بستیوں سے نقل مکانی کرکے گورے ٹٹ پونجئے طبقہ سے آن ملا تھا۔ نتیجہ کے طور پر اب غریب بستیوں میں محض نچلے ترین طبقہ کے وہ لوگ رہ گئے جن کی معاشی و سماجی حالت غیر انسانی حد تک گری ہوئی تھی۔ ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد زمین دوز subway ریل کی خالی سرنگوں میں یوں رہتی تھی جیسے چوہے بلوں میں رہتے ہیں اور یا پھر آوارہ گردوں کی طرح تفریح پارکوں کی بنچوں پر یا جھاڑیوں میں پڑے رہتے اور پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہتے۔

گو امریکہ کی اکثریتی آبادی دیہاڑی کے طور پر کام کرکے زندہ رہتی تھی اور لوگ جو کچھ کماتے' شام کو کھاپی لیتے۔ مگر غریب بستیوں کے لوگوں کو دیہاڑی کی نوکری بھی باقاعدہ طور پر میسر نہیں تھی۔ اس لئے ان کی ایک بڑی تعداد بھیک مانگنے پر مجبور ہوجاتی اور کبھی کبھی لوٹ مار اور چوری چکاری پر بھی اتر آتی۔ مگر اب وہ سیاسی شعور اور اجتماعی احتجاج کم ہی دیکھنے میں آتا جو کہ ساٹھ کی دہائی کا خاصہ تھا۔

دوسری طرف امیر گوری بستیاں تھیں' جو اتنی خوشحال و خوبصورت کہ ان کو دیکھنے پر جنت کا گمان ہوتا۔ ان بستیوں میں تتلیوں کی طرح حسین و جمیل لڑکیاں اور مضبوط گھٹے کے گورے چٹے لڑکے جیسے کہ خیالی جنت کے حور و غلماں ہوں۔ اور تیسری دنیا کے بیشتر غریب لوگوں کا تاثر تھا کہ یہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں جن کے کناروں پر گوری حوریں ان کی منتظر ہیں۔ وہ زندگی بھر یہاں آنے کے خواب دیکھتے رہتے تھے اور

شاید اب بھی دیکھتے ہیں۔ یہ تاثر حقیقت میں امریکی معاشرے کے زور آور کمرشیل اور بوژوا کلچر کی پیداوار ہے۔

مانٹریال سے نیویارک آنے کے چند دن بعد میں نے مشرقی ھارلیم' جسے ہسپانوی ھارلیم بھی کہتے ہیں Patte Castelo نام کے ایک جپسی سردار سے ملنے کا قصد کیا۔ اس کا اتہ پتہ مجھے ٹورانٹو میں جپسی کانفرنس کی کرتا دھرتا Rena C. Gropper نے دیا تھا' جو خود جپسیوں کے بارے میں ایک مشہور کتاب کی مصنفہ بھی ہیں۔ میں نے ساتھ کی سڑک' پارک ایونیو پر واقع زمین دوز اسٹیشن میں اتر کر ریل پکڑی اور مشرقی ھارلیم میں میلکم ایکس بولیوارڈ پہونچا۔ مشرقی پارک ایونیو اور لیکسینگٹن Lexington کے عین بیچ Castello کا گھر تھا اور نشانی کے طور پر قسمت کا احوال بتلانے والی اس کی بیوی مارتھا کا بورڈ گھر کے سامنے لگا تھا۔

میں نے گھنٹی بجائی تو ایک ادھیڑ عمر کا چھریرے بدن کا چاق و چوبند آدمی نمودار ہوا۔

"کیا آپ پیٹی کاسٹیلو ہیں؟" میں نے پوچھا

"ہاں میں ہی ہوں" اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" اس نے فوراً" سوال کیا۔ میں نے مختصراً" اسے جپسی کانفرنس کے بارے میں بتلایا اور جپسی خاندانوں میں اپنی دلچسپی کے بارے میں بھی۔

"تمہیں میرے گھر کا پتہ کس نے دیا؟" اس نے پھر منہ پھٹ سا سوال کیا۔

"تمہارا پتہ مجھے رینا۔سی۔گروپر' نے دیا۔" کون "گروپر" اس نے بات کاٹتے ہوئے خانہ بدوشوں کی سی لاابالی پن سے پوچھا۔

"وہ ایک خاتون ہیں جو Hunter College ہنٹر کالج میں انتھروپولوجی پڑھاتی ہیں اور تمہاری دیرینہ دوست ہیں۔"

"ہاں' Sweety سویٹی! مگر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں تم سے چاہتا واہتا کچھ نہیں....." میں نے جھینپ مٹاتے ہوئے کہا۔ مجھے جپسیوں سے ملنے کا شوق ہے۔ وہ ایک دن ہندوستان سے آئے تھے۔ بس اسی لئے میں

ان کی تاریخ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں تو یہاں پیدا ہوا ہوں۔ ہم تو امریکہ کے لوگ ہیں۔ ہمارا ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں۔" اس نے پھر جان چھڑانے کی کوشش کی۔

مجھے معلوم ہے کہ تم امریکن ہو۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ امریکہ کے بیشتر لوگ ادھر ادھر سے آکر آباد ہوئے ہیں۔ کتنے ہی اپنی جڑوں کے بارے میں شعور رکھتے ہیں۔ تم جپسی لوگوں کی زبان و ثقافت بھی ہندوستان کے لوگوں سے ملتی جلتی ہے اور میں اس کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔

"اچھا' آج تو میں بہت مصروف ہوں۔ تم کسی اور دن آنا۔" اس نے کچھ نرم لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔

کب؟ "میں نے بے صبری کے ساتھ پوچھا۔"

"اگلے ہفتہ۔"

"کس دن؟" میں خوش ہوگیا۔

"اگلے منگل کو آجانا۔"

اتنے میں کاسٹیلو کی بیوی مارھتا بھی ہمارے کمرے میں داخل ہوئی اور مجھے دیکھ کر بچوں کی طرح مسکرادی۔ اس دوران کاسٹیلو مجھ سے ہاتھ ملائے بغیر تیزی کے ساتھ گھر کے اندر چلا گیا اور میں خوش خوش اسی تیزی کے ساتھ باہر سڑک پر نکل آیا۔

کمبخت' کتنے مشکل لوگ ہیں۔ میرے دل میں غصہ کی بجائے ہمدردی کے جذبات غالب آگئے۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ دنیا بھر کی ہزاروں سال کی خانہ بدوشی کے دوران جپسی لوگوں نے بیگانگی اور اجنبیت کی صورت میں بہت اذیتیں اٹھائی ہیں اور اب بھی قانون کی زد میں بیشتر مغربی ممالک میں اچھوتوں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔ اس لئے وہ اجنبی لوگوں سے راہ و رسم بڑھاتے وقت بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ہندو پاک کے خانہ بدوشوں میں گھل مل لینے میں مجھے بالکل اسی قسم کے تجربات حاصل ہوئے تھے۔ اور ہمارے ہاں بھی نیویارک کے جپسیوں کی طرح سب سے زیادہ مشکل لوگ میں نے شامی خانہ بدوشوں (جوتشیوں) کو ہی پایا اور ابھی تک میرے تجربے نے یہی اشارے دیئے تھے کہ ہندوپاک کے خانہ بدوشوں اور بین الاقوامی جپسیوں کی

ایک ہی جڑیں ہیں اور یہ کہ وہ ہندوستان کی قدیم دراوڑ تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں اور باہر بھی دنیا نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اور وہ اچھوتوں کی سی زندگی گزارتے رہے ہیں اور جوں جوں مجھے ان حقائق کا پتہ چلا' میری دلچسپی جپسیوں میں بڑھتی چلی گئی اور میں نے بین الاقوامی جپسیوں اور ہندوپاک کے خانہ بدوشوں کے مابین تقابلی تحقیق کرنے کے خواب بنے۔ خواب اس لئے کہ آج کل دنیا بھر میں بکھرے ہوئے لوگوں تک رسائی اور کام کے لئے بے انتہا وسائل کی ضرورت تھی اور میں تو خود بھی نرا خانہ بدوش ٹھہرا۔ دوسرے ایک اور حقیقت نے مجھے متحیر کیا وہ یہ کہ جپسیوں کی رومنی زبان پر راجستھان اور گجرات کی زبان اور ان ہی علاقوں کے خانہ بدوشوں کی ثقافت کا غلبہ تھا۔

(۶)

چلپسی عورت مارتھا

اگلے ہفتہ، مئی کی ۲ تاریخ اور منگل کے دن ٹھیک گیارہ بجے میں زمین دوز ریل کے ذریعہ کاسٹیلو کے گھر پہونچ گیا۔ میں نے بڑے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی تو پرندے کی طرح ہلکی پھلکی ادھیڑ مارتھا نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ دروازہ کھولا۔

"کیا کاسٹیلو گھر پر نہیں ہیں؟" میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا ۔

"ہاں ہیں تو یہیں، پر مکانوں کے کرایہ کے سلسلہ میں اوپر کی منزل پر گیا ہے۔" مارتھا ایک عجیب سے لہجے میں انگریزی بولتی تھی کیولری فوج کی نوکری کے دوران قوت سماعت خراب ہوجانے کی وجہ سے مجھے سننے میں خاصی دقت پیش آتی تھی۔

"مکانوں؟ کیا تمہارے اپنے کئی مکان ہیں؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اوہ، یہ کونے والی عمارت دیکھی ہوگی جدھر سے تم آئے ہو۔ اس میں ۲۶ فلیٹ ہیں۔ ہم نے پچھلے سال اسے بیچا ہے۔ کیونکہ یہ ہسپانوی اور سیاہ فام آبادی والا علاقہ ہے اور یہاں کرایہ دار بہت تنگ کرتے تھے۔ کرایہ بھی وقت پر نہیں دیتے تھے اور پھر توڑ پھوڑ بھی بہت زیادہ ہوتی۔ میرا خاوند تو سارا دن اسی میں سر کھپاتا رہتا۔ تو تنگ آکر ہم نے اسے بیچ دیا۔" کتنا کرایہ تھا اس بلڈنگ کا؟" میں نے پوچھا۔

"کرایہ؟ کوئی ۶۰۰ ڈالر فی فلیٹ تھا۔ اب ہمارے پاس صرف تین چھوٹی عمارتیں رہ گئی ہیں۔ اس عمارت میں جس میں تم بیٹھے ہو، تین فلیٹ ہیں۔ دو فلیٹ ہزار، ہزار ڈالر ماہوار کے ہیں اور نیچے والے گراؤنڈ پر پندرہ سو ڈالر کا ہے۔ دو بلڈنگیں اور ہیں ان

میں بھی تین تین فلیٹ ہیں۔ چھوٹی عمارتوں کو سنبھالنا آسان ہے۔" مارتھا بولتی گئی۔

"مارتھا' تمہارے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"پیسہ؟ یہ میں نے قسمت کا حال بتا کر لوگوں سے کمایا ہے"

ہاتھ دیکھ کر قسمت بتلانے سے اتنا پیسہ؟ کیونکہ ایک تو قانونی طور پر امریکہ میں اس دھندے پر پابندی ہے اور دوسرے تمہاری فیس تو محض دس' پندرہ ڈالر فی کس ہے۔"

"ہاں فیس تو اتنی ہی ہے' پر جب نفسیاتی مشکلات میں گھری ہوئی امیر گوری عورتیں میرے پاس آتی ہیں' کسی کا خاوند سے جھگڑا تو کسی کا طلاق کا قصہ' تو کوئی محبت میں گرفتار میں انہیں امید دلا کر بہت سارے پیسے بٹور لیتی ہوں اور جو آدھے میں گورنمنٹ کو ٹیکس دے دیتی ہوں۔" مارتھا نے فخر کے ساتھ کہا۔

"اچھا! تو تم نے زیادہ سے زیادہ کسی ایک فرد سے کتنا پیسہ لیا ہوگا' مارتھا؟"

"اوہ! دس ہزار ڈالر بھی' بیس ہزار ڈالر بھی اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ۔ مگر کیلفورنیا میں قسمت بتلانے والے ہمارے کچھ لوگ بہت امیر ہیں۔ بڑی بڑی عمارتوں کے مالک ہیں اور رولز رائس' کاروں میں سفر کرتے ہیں۔ مگر میں اب بوڑھی ہوگئی ہوں' زیادہ دھندا نہیں کرتی۔" مارتھا نے کہا۔

"اچھا تو گویا یہ سارا پیسہ تم نے کمایا اور کاسٹیلو نے اسے بیوپار میں لگایا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' یہ دھندا صرف جپسی عورتیں کرتی ہیں۔ مرد زیادہ تر بیکار گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ بہت کاہل اور ست واقع ہوئے ہیں۔"

"ہاں' ہمارے ہاں کے خانہ بدوشوں کی طرح "میں نے ازراہ مزاق کہا۔" مگر کاسٹیلو کے بارے میں بھی تمہارا یہی خیال ہے؟

"نہیں کاسٹیلو بہت ہوشیار ہے۔ سب کام کرلیتا ہے' تم جو کہو وہی۔ وہ بہت تیز اور ذہین ہے۔" مارتھا نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"تمہارے کتنے بچے ہیں مارتھا؟"

"دس بچے ہیں۔ پانچ لڑکے اور پانچ ہی لڑکیاں۔ سب جوان اور شادی شدہ ہیں۔"

"تو تمہارے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بھی ماشاء اللہ خوب ہوں گے؟"

"چالیس ہیں خیر سے" اس نے فخر سے کہا۔ پھر خود کلامی میں مارتھا بولتی گئی۔ "بہت سے جپسی چرچ جاتے ہیں۔ مگر مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ بہت سے "ماں" کی پرستش کرتے ہیں۔"

"تعجب ہے" میں نے بات کاٹتے ہو کہا۔ ہمارے ہاں بھی خانہ بدوش زیادہ تر "ماتا" کی پوجا کرتے ہیں۔

"اچھا!" مارتھا حیران ہو کر مجھے گھورنے لگی۔

"ہندوستان کے زیورات مجھے بہت پسند ہیں۔" اس نے میرے داہنے ہاتھ پر چڑھے کڑے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یہاں ہمارے نزدیک ہی ایک ہندوستانی جوڑا رہتا ہے۔ اس کی عورت بہت خوبصورت زیورات پہنتی ہے۔ خاص کر اس کے گلے کے ہار تو بہت ہی اچھے لگتے ہیں۔"

"اچھا تو اگلی بار میں اگر نیویارک آیا تو تمہارے لئے گلے کا ہار لے کے آؤں گا۔" میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے کہا۔

"تمہارے ہاں سونا بھی تو سستا ہے نہ۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "مگر یہاں تو لوگ لوٹ لیتے ہیں۔ اور چلو لوٹ ہی لیں، مگر وہ آدمی کو مار بھی دیتے ہیں۔ ہارلیم اس معاملہ میں بہت بدنام ہے۔ جپسی عورتیں جب پارٹیوں میں جاتی ہیں، تو زیورات تھیلے میں ڈال کر لیجاتی ہیں۔ محفل کے دوران پہن لیتی ہیں اور جب گھر لوٹتی ہیں تو پھر تھیلوں مین ڈال لیتی ہیں۔"

مارتھا ابھی بول ہی رہی تھی کہ کاسٹیلو ہاتھ منہ دھو کر اور باہر کے سردی کے کپڑے اتار کر ہمارے کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھتے ہی مجھ سے رجوع ہوا۔

"What is your problem، تمہیں تکلیف کیا ہے؟"

تکلیف و کلیف تو مجھے کچھ نہیں۔" میں نے جلدی سے ٹورانٹو والی جپسی کانفرنس کا پروگرام جیب سے نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں جپسی بھائیوں سے ملنا چاہتا ہوں اور اس میں اپ میری مدد کرسکتے ہیں۔" جب میں بول رہا تھا تو کاسٹیلو

نے غور سے پروگرام کا جائزہ لے کر پوچھا۔

"یہ تمہارا نام ہے؟ تو تم نے کانفرنس میں کوئی خاص بات کہی؟" کاسٹیلو نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "ہاں میں نے Gypsologists سے ہٹ کر ہندوستانی خانہ بدوشوں کے حوالے سے جپسیوں کے بکھرجانے کی تاریخ کے بارے میں کچھ حقائق پر روشنی ڈالی تھی۔"

"کیا؟"

"یہ تو لمبی بات ہے" میں نے کہا۔ "میں اگلی بار اپنے مقالے کی کاپی آپ کو لادوں گا۔"

"ہاں یہ ایجپٹ (Egypt) ہندوستان سے کتنا دور ہے؟ کہتے ہیں کہ جپسی، ایجپٹ سے آئے تھے۔؟ کاسٹیلو نے پوچھا۔

"میری نظر میں تو مصر سے جپسیوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ البتہ زبان اور ثقافت کے حوالے سے یہ کہنا مشکل نہیں کہ ان کا تعلق ہندوستان سے ضرور ہے۔"

"کیا تم عیسائی ہو؟" کاسٹیلو نے پوچھا۔

میں نے بتلایا کہ میں پیدا تو مسلمان گھرانے میں ہوا تھا، مگر اب محض انسان ہوں اور دنیا کے سب مذاہب کا احترام کرتا ہوں، مگر کسی قسم کی مخصوص مذہبی پابندیوں کا قائل نہیں۔

"مگر ہم لوگ تو کیتھولک عیسائی ہیں" اس نے کہا۔

"تو مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے" میں نے کہا۔ "مجھے تو جپسیوں کی پرانی تاریخ و ثقافت و زبان سے دلچسپی ہے۔ ان کے مذہبی عقائد سے کوئی سروکار نہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم اگلی بار اپنا مقالہ لے کر آنا۔ میں اسے کچھ لوگوں کو دکھلاؤں گا اور پھر شاید کچھ لوگ تم سے ملنا پسند کریں۔ ابھی مجھے کہیں جانا ہے۔" یہ کہہ کر کاسٹیلو اپنی کرسی سے اٹھا اور ہوا کے ایک جھونکے کی طرح پل بھر میں غائب ہوگیا۔ مارتھا اور کاسٹیلو کی باتوں میں کتنی صداقت تھی اور کتنی ڈینگیں یہ تو میرے لئے اس چھوٹی سی ملاقات کے بعد کہنا مشکل ہے۔ مگر اس دوران انہوں نے جھوٹے منہ ایک چائے کی

پیالی کا بھی نہیں پوچھا۔ جب میں ان کے گھر سے نکل کر میلکم ایکس بولیوارڈ پر آیا تو مجھے احساس ہونے لگا کہ ہمارے اپنے خانہ بدوشوں کی طرح اب بھی یہ کتنے ٹوٹے پھوٹے اور کتنے الجھے ہوئے ہیں۔ اب بھی ان کا اس جھوٹی اور کرخت دنیا پر کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ میں ذہن میں بہت سے وسوسے لئے بوجھل قدموں کے ساتھ Manhattan کے لئے زیر زمین Subway ریل پکڑنے سرنگ نما راستہ میں اتر گیا۔

(۷)

ہاتھی کے دانت

امریکی معاشرہ ہاتھی کے دانتوں کی مانند ہے' یعنی کھانے کے لئے ایک تو دکھانے کے لئے دوسرے۔ مثل مشہور ہے کہ امریکہ میں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ مگر جس چیز کی امریکہ کے لوگوں کو بے حد تلاش رہتی ہے' وہ ہے ذہنی سکون۔

یوں بھی مایا اور سکون کا تو سدا کا ہی کتا' بلی کا بیر رہا ہے۔ جہاں بھی مادی افراط ہوگی' وہاں روحانی سکون کا اسی شدت سے فقدان ہوگا اور امریکی معاشرہ کے ہر پہلو سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ یا تو ہروقت مشین کی طرح کام میں جتے رہتے ہیں اور یا پھر سکون کی تلاش میں نت نئے حربوں میں سرگرداں۔ خواہ غریب ہوں یا امیر ذہنی سکون کا فقدان اس معاشرے کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ غالباً" اس کا ایک تاریخی پس منظر بھی ہے۔ مثال کے طور پر موجودہ امریکی معاشرہ یہاں کے قدیم باشندوں' یعنی ریڈ انڈین لوگوں کی مکمل نسل کشی کے نتیجے پر قائم ہوا تھا۔ اور پھر افریقہ سے لوگوں کو لاکھوں کو تعداد میں غلام بنا کر اور ان کی محنت کو استعمال میں لاکر اسے عروج پر پہنچایا گیا۔ ظاہر ہے اس قسم کے معاشرہ کی بنیادی نفسیات میں شدید قسم کے احساس جرم کا ہونا فطری بات ہے۔ اس ضمن میں نیویارک کا شہر اس معاشرے کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔ یہاں ایک طرف تو دیو ہیکل مگر کھلونوں کی طرح شیشے جڑی ہوئی بڑی بڑی چمکدار عمارتیں ہیں جو آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف ھارلیم نما بستیاں اور زمین دوز غار نما سرنگیں ہیں' جنہیں Subway سب وے بھی کہا جاتا ہے اور لاکھوں غریب لوگ انہی کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ میں نے یہاں کے اکثر لوگوں

کو نیند نہ آنے کی شکایت کرتے سنا ہے۔ شاید اسی لئے اکثر لوگ سونے سے پہلے شراب یا ڈرگ کا سہارا لیتے ہیں، تاکہ سکون سے سو سکیں۔ اسی لئے یہاں Broadway براڈوے طرز کے شراب خانے اور ناچ گھر، رات بھر لوگوں سے کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں۔

عام امریکی لوگوں کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ آنکھ سے اوجھل تو دماغ سے بوجھل۔ اس میں شاید ان کا قصور بھی نہیں، امریکی معاشرہ کی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے۔ افراد، خاندان و گھرانے مسلسل حرکت میں رہتے ہیں اور ایک آدھ سال سے زیادہ ایک ٹھکانہ پر کم ہی رہ پاتے ہیں۔ بیشتر لوگوں کے اپنے مستقل گھربار نہیں ہوتے۔ اب بھی آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو ویگن گاڑیوں یا موبائل ٹریلروں میں بسیرا کرتے ہیں اور ضرورت کیمطابق کیمپ کرتے ہوئے ادھر سے ادھر پھرتے رہتے ہیں۔ کھچاؤ اور دباؤ کی کیفیت یہاں کے لوگوں کی چال ڈھال و نیز انگ انگ سے عیاں ہوتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر بہت کم لوگ سنجیدہ پڑھائی لکھائی کی طرف دھیان دے پاتے ہیں۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک اکثر لوگ ٹیلی ویژن دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں جن کی بیسیوں چینل ہوتی ہیں اور وہ چوبیس گھنٹے چلتے رہتے ہیں۔ یہ پروگرام دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کھیل کود، تفریح، ناچ، موسیقی ناٹک یہاں تک کہ شہوانی تسکین سے لے کر گورنمنٹ کے مستقل پروپیگنڈے تک ہر چیز ٹیلی ویژن پر مہیا کی جاتی ہے۔ اسی لئے امریکی لوگ باہر کی دنیا کے بارے میں خاصے کورے ہوتے ہیں۔

آپ جہاں بھی جائیں یہ جملہ آپ کو بار بار سنائی دے گا۔

"Oh I didnt know that"

"اچھا! مجھے تو اس کا علم ہی نہیں تھا" ایک بار مجھے ایک امریکی نے پوچھا۔

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

میں نے کہا "پاکستان"

"پاکستان؟" اس نے کہا "وہ کہاں ہے، اسرائیل میں؟"

میں نے ازراہ مزاق جواب دیا۔ "نہیں وہ افریقہ میں ہے۔"

اوہ! آئی ڈیڈنٹ نو دیٹ" وہ مطمئن ہوگیا۔

ایک دفعہ ایک پڑھے لکھے صاحب نے پوچھا۔ "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"تم بتلاؤ" میں نے کہا۔

"ارجنٹائن" اس نے فخر سے کہا۔

"آپ بارہ ہزار میل دور نکل گئے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"اوہ! بنگلہ دیش" وہ جھینپ کر مسکرا دیا۔

امریکہ سے باہر کی دنیا میں اگر امریکی آدمی کا تاثر Ugly American یعنی بھدے امریکی سے لیا جاتا ہے تو ▪ قطعی طور پر بے معنی نہیں ہے۔ اور اگر بیشتر ممالک میں Yanky go home امریکی نکل جاؤ، کے نعرے لگتے رہے ہیں تو وہ بھی بلا وجہ نہیں ہوتے۔ بیشتر امریکی لوگوں کی تربیت، دولت کی ریل پیل، اچھے کھانے پینے کے ساتھ ساتھ جنسی بے راہ روی اور ایک اکھڑے سے ماحول میں ہوتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر امریکی سفارتی نمائندوں، بیوپاریوں، سیاحوں اور فوجی اڈوں کے سپاہیوں کی صورت میں جہاں بھی جاتے ہیں، اپنے پیچھے علاقائی لڑائی جھگڑوں، معاشرتی و سماجی لوٹ کھسوٹ کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ممالک میں بڑے بڑے چکلے، عیاش گھر اور دلال چھوڑ آتے ہیں جو ان کے لئے کوئی نیک نامی کا باعث نہیں ہوتے۔

جہاں تک ان کے اپنے ملک میں لوگوں کا تعلق ہے، جیسا میں نے پہلے کہا، انہیں رابوٹ، ریمبو اوز پلاسٹک کمرشل کلچر کی ڈزنی لینڈ میں Comatose کی حالت میں بے حس رکھا جاتا ہے، تاکہ ▪ حکومت کی غیر جمہوری پالیسیوں پر اثر انداز نہ ہوں، اور اس کا جمہوری بھرم بھی قائم رہے۔ غرض کہ امریکہ ایک ایسے قوی ہاتھی کی مانند ہے جس کے پیروں تلے نہ صرف ان کے اپنے بلکہ دنیا بھر کے غریب لوگ کچل دیئے جاتے ہیں۔

البتہ امیر طبقہ نے امریکی سرزمین پر جو اپنے لئے جنت بنا رکھی ہے، ▪ کتنی حسین اور محفوظ ہے، اس کا بیان مجھ جیسے حساس آدمی کے بس کی بات نہیں۔ حقیقت میں یہ کام ہمارے ٹیلی ویژن، اخبارات، حکومتی ادارے اور امریکی دلال پہلے ہی بڑی شدت سے کرتے رہے ہیں۔ میں تو یہاں بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ جو لوگ اس جنت کی بناوٹ کے تاریخی پس منظر سے واقفیت رکھتے ہیں وہ کسی بھی قیمت پر اس کا حصہ بننے کو تیار

نہیں ہوسکتے۔ شاید اس لئے بھی کہ میں کسی بھی حالت میں مادی دنیا کے آرام و آسائش کا تبادلہ اپنے روحانی سکون کے ساتھ کرنے کو تیار نہیں۔ مجھے اپنے لوگوں کے ساتھ دکھ بانٹنے میں شانتی ملتی ہے اور یہی میری زندگی کی سب سے بڑی کمائی بھی ہے۔

”یہاں دلال سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ فصیح جو نیویارک کے سینٹرل پارک میں ایک بینچ پر میرے بازو میں بیٹھا، میری ڈائری میں جھانک رہا تھا، پوچھا۔

”اس سے میرا مطلب ہے“ میں نے کہا ”تیسری دنیا کے طبقات یا افراد جن کا معاشی مفاد امریکہ کے بین الاقوامی مفادات کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور جو اپنے قومی مفادات کو امریکی مفادات کے لئے قربان کردیتے ہیں۔ یہ لوگ اکثر اوقات یا تو فوجی ڈکٹیٹر شپ کے حامی ہوتے ہیں اور یا پھر جمہوریت کے بھرم کی آڑ میں جاگیردار اور سرمایہ دار نوکر شاہی کے ٹولہ کا حصہ“

”میرا خیال ہے، امریکہ سے متعلق تمہارے خیالات بہت متعصبانہ ہیں اور تم انصاف نہیں کر رہے۔“ فصیح نے امریکی معاشرہ کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

”اگر یہاں دولت کی ریل پیل ہے تو اس کے لئے یہ لوگ محنت کرتے ہیں۔ اور اگر پاکستان جیسے ملک میں پسماندگی یا غربت ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کام نہیں کرتے اور یہ کہ معاشرہ عمومی طور پر بدعنوان اور رشوت خور ہے، اس میں امریکہ کا کیا قصور بھلا؟“ فصیح نے زور دے کر کہا۔

میں نے کہا ”فصیح اگر کوئی محض محنت کے ذریعہ امیر بن سکے تو سب سے زیادہ امیر گدھے کو ہونا چاہئے اور یا پھر چیونٹی کو کہ وہ ہر وقت بے چون چرا محنت کرتے ہیں۔ مگر نہیں، میرے بھائی انسان اپنی محنت سے امیر نہیں بنتا بلکہ دوسروں کی محنت کا استحصال کرکے ہی امیر بنتا ہے۔ اس لئے امریکہ کی دولت کا راز لاکھوں غریبوں کی سستی محنت اور خون پسینے میں مضمر ہے۔

(۸)

باپسی سدھوا

"ٹرن ٹرن ٹرن" ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"خورشید تمہارا فون ہے"۔ میرے دوست اکی شیخ نے بستر میں لیٹے لیٹے آواز دی۔

"ہیلو" میں نے لپک کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔

"خورشید، میں زیبا بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"کیسی ہو زیبا، خیریت ہے نا؟" میں نے ازراہ آداب پوچھا "بس ٹھیک ہی ہے۔ تمہیں یاد ہے نا کہ آج شام کو ہم کو باپسی سدھوا کے ہاں جانا ہے۔"

"بالکل یاد ہے" میں نے جواب دیا۔

"تو بس تیار ہو کر شام کو پورے چھ بجے میرے ہاں پہونچ جانا۔ فوزیہ اور شاہد وغیرہ بھی ہوں گے۔ سب ساتھ ہی چلیں گے۔"

"بہت اچھا، بائی، زیبا۔" میں نے ریسیور واپس ٹیلی فون کے کھانچے میں رکھ دیا۔

زیبا حیدر ہندوستان کی مشہور ناول نگار قرۃ العین حیدر کی بھانجی تھیں اور ان دنوں ایک اعلیٰ بینک افسر کے طور پر نیویارک میں کام کرتی تھیں۔ زیبا کی والدہ، خالدہ حیدر انصاری جو لاہور کے کالج آف ہوم اکنامس، گلبرگ میں پڑھاتی رہی ہیں، ان سے میری بہت پرانی دوستی تھی اور زیبا کو میں بچپن ہی سے جانتا تھا۔ خالدہ بھی ان دنوں زیبا سے ملنے نیویارک آئی ہوئی تھیں اور میں اکثر ان کے ہاں جاتا تھا۔

شام کو حسب پروگرام ریور ڈرائیو' پر واقع زیبا کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تو فوزیہ اور آغا شاہد علی بھی وہاں موجود تھے۔ یہ لوگ ان دنوں نیویارک کے آس پاس کالجوں میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ فوزیہ کا تعلق بھی لاہور سے تھا' مگر شاہد علی سری نگر کشمیر کے رہنے والے تھے۔

ان سب کو باپسی سدھوا نے سلمان رشدی کی متنازعہ کتاب شیطانی آیات' کے سلسلہ میں بات چیت کے لئے بلوایا تھا۔ باپسی سدھوا کا تعلق لاہور کے ایک پارسی خاندان سے تھا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان دنوں انگریزی زبان میں پاکستان کی واحد ناول نگار تھیں جن کی مغرب میں خاص شہرت تھی۔ جب انہوں نے Crow Eaters کرو ایٹرز کے نام سے ناول لکھا تو انہیں بین الاقوامی شہرت ملی۔ اب وہ کئی ایک مقبول ناولوں کی مصنفہ تھیں۔ ان دنوں کولمبیا یونیورسٹی سے منسلک تھیں اور ان کی ایک کتاب Ice Candy Man آئس کینڈی مین زیر طباعت تھی۔

جب ہم باپسی سدھوا کے ہاں پہنچے تو اس نے بہت ہی دلپذیر طریقہ پر خندہ پیشانی کے ساتھ خوش آمدید کہا اور خوب خاطرمدارت کی۔ کسی بھی سچے ادیب کا اولین فرض ہوتا ہے کہ اپنی ذات اور اردگرد کے معاشرہ کے منفی پہلوؤں کو نہ صرف ٹھکرائے بلکہ ممکنہ طور پر ان کی چیرہ دستی بھی کرے۔ باپسی نے ایسا ہی کیا۔ اس نے اپنے ناولوں میں پارسی قوم کی خودپرستی اور اقلیتی تنگ نظری کو نہ صرف نشانہ بنایا ہے بلکہ باہر کی دنیا کو اس سے روشناس بھی کرایا ہے۔ اسی لئے پارسی لوگ باپسی سدھوا کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ شاید اسی لئے اب وہ مستقل طور پر نیویارک میں رہائش پذیر ہے۔

باپسی کے خیال میں سلمان رشدی کی کتاب "شیطانی آیات" نیک نیتی کے ساتھ نہیں لکھی گئی تھی۔ اس نے کہا "گو سلمان رشدی بلاشبہ بہت باصلاحیت ادیب ہے اور خاص طور پر ہندوستان سے متعلق "مڈ نائٹ چلڈرن" اور پاکستان کے بارے میں "شیم Shame" لکھ کر یورپ میں بہت مقبول ہوا۔ مگر شیطانی آیات' لکھ کر اس نے گھٹیا پن کا ثبوت دیا ہے اور بیجا طور پر مغرب کے قارئین کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ کامیاب بھی ہوا ہے اور پیسہ بھی کمایا ہے۔ مگر پھر بھی اس کا سہرا ایران کے آیت اللہ خمینی کے سر باندھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اگر آیت اللہ خمینی سلمان

رشدی کی موت کا پروانہ جاری نہ کرتے تو "شیطانی آیات" کو کبھی وہ شہرت نہ ملتی، جو اس کی وجہ سے ملی۔

باپسی نے اس ضمن میں مغرب کی منافقانہ آزادی تحریر پر بھی اظہار خیال کیا۔ اس عرصہ میں خاموشی سے بیٹھا اس کے خیالات سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ میری طرف رجوع ہوئی۔

"اچھا خورشید، تم نیویارک میں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے بتلایا کہ میں تو سندھ کے دیہات میں رہتا ہوں اور آج کل جپسی Gypsy لوگوں کے ہندوستان سے نکل کر دنیا بھر میں بکھر جانے پر مقالہ پڑھنے ٹورانٹو یونیورسٹی آیا تھا۔

"سندھ کے دیہات میں بیٹھ کر بین الاقوامی جپسیوں پر مقالہ پڑھنے ٹورانٹو یونیورسٹی آنا تو غیر معمولی بات ہے۔" اس نے میری حوصلہ افزائی کی۔

"بس محض مشاغل کے طور پر کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں۔" جب اسے پتہ چلا کہ میں سندھ کے افریقی شیدیوں کے بارے میں تحقیقی مقالے بھی لکھتا رہا ہوں اور یہ کہ آج کل ھارلیم میں ان کے لئے ثقافتی رابطے کی راہیں تلاش کر رہا ہوں، تو وہ بہت خوش ہوئیں۔

"ارے تم تو بہت چھپے رستم نکلے۔ کیا تم شیدیوں اور جپسیوں کے بارے میں اپنے مضامین مجھے بھیجو گے؟ شاید ہم ان کو یہاں چھپوا سکیں۔" اس نے ایک بار پھر میرا دل رکھنے کی کوشش کی۔ اور میں باپسی سدھوا کے خلوص، خوش دلی اور کہنا چاہیے کہ ادیبانہ فراخدلی سے بہت متاثر ہوا۔

باپسی سدھوا کے ساتھ یہ شام خاصی دلچسپ ہوسکتی تھی، مگر فوزیہ اور شاہد جو خاصے جوان سال ہونے کے ساتھ ساتھ امریکہ میں اپنی نئی نئی پیشہ ورانہ جڑوں کو مضبوط کرنے میں اور امریکی جنت کے پھل فروٹ کھانے میں شاید اسقدر مسحور تھے کہ انہوں نے اس محفل میں کسی اور کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ گھنٹوں انتھک چڑیوں کی طرح چہچہاتے رہے۔ یہاں تک کہ آدھی رات کو جب یہ محفل برخواست ہوئی تو میرے سر میں ہلکا سا درد تھا اور عمومی طور پر مجھے آسانی سے سردرد نہیں ہوتا۔

میں یہ سب کچھ کسی بدنیتی کے طور پر نہیں کہہ رہا۔ حقیقت میں فوزیہ اور شاہد علی تو وہاں کے ہزاروں ایشیائیوں میں گنے چنے لوگ تھے۔ میں تو یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ نوارد لوگ امریکی معاشرہ کی پلاسٹک کی چمک دمک سٹیل کی کھن کھناہٹ اور معاشرتی بوکھلاہٹ میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ آنے والی آدھی زندگی کے گزر جانے تک نہ تو ان میں زندگی کی ڈگر اور سمت کا احساس قائم رہتا ہے اور نہ ہی سوچ اور عمل کے اعتبار سے توازن۔ وہ تو بس ایک جنت کی تلاش میں بڑے سے بڑے دریائی دھارے میں بہہ کر امریکی معاشرے کے خوف ناک اور وسیع سمندر میں جاگرتے ہیں اور پھر زندگی کے مدار سے ڈھلنے تک لوٹ کر نہیں دیکھتے اور بالاخر جب لوٹ کر دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں تو بہت دیر ہوچکی ہوتی ہے اور ساحل دور کہیں بہت دور گرفت سے باہر نظر آتا ہے۔

(۹)

روح کا ناچ

جب میں پہلی اپریل ۱۹۸۹ء کو "اپریل فول" کی سی کیفیت میں نیویارک پہنچا تو سرما کا موسم اپنے آخری سانس لے رہا تھا۔ گو کناڈا میں ابھی کہیں کہیں برف باری جاری تھی اور اونٹاریو کی جھیل کے کناروں کے ساتھ ساتھ برف سل کی مانند جمی نظر آتی تھی۔ مگر جب میں مئی کے مہینے میں نیویارک واپس آیا تو بہار کا موسم اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ پھوٹ پڑا تھا۔ سینٹرل پارک ویسٹ غالباً" مین ہیٹن کے بیچوں بیچ میلوں میل پھیلا ہوا نیویارک کا سب سے بڑا تفریحی پارک ہے۔ یہاں چھٹی کے دن ہزاروں لوگ کھیل تفریح کے لئے جمع ہوجاتے ہیں اور پھر دن بھر میلے کا سا سماں بندھا رہتا ہے۔ جوگنگ، کھیل، سائیکلنگ، سکیٹنگ، ناچ گانے ہر طرف بکھر جاتے ہیں۔ جس میں بوڑھے، جوان، عورتیں اور بچے سب ہی اپنے بھڑکیلے اور رنگ برنگے ملبوسات زیب تن کئے شامل ہوتے ہیں۔ غرضیکہ ان دنوں نیو یارک میں بہت ہی سہانا سماں ہوتا ہے۔

اونچے اونچے درختوں میں نئی کونپلیں اور چیری کے درختوں میں اودے اودے پھول کھل پڑتے ہیں، جو بارش کے بعد زمین پر گر کر یوں لگتے ہیں، جیسے سڑکوں اور پگڈنڈیوں پر کسی نے رنگا رنگ قالین بچھادی ہو۔ ہری بھری ہر سو پھیلی گھاس، اودے، پیلے اور نیلے پھولوں کے پس منظر میں فرش کا کام دیتی ہے۔ خنک ہوا اور آسمان پر پھیلے گھنے بادل جو وقتاً" فوقتاً" ہلکی ہلکی بارش کے ساتھ برس پڑتے ہیں، یہاں کے موسم کا خاصہ ہیں۔

میں چونکہ راجستھان کے ریگستان کی پیداوار ہوں، اس لئے ساون کا موسم، اڈتی گھٹائیں، اور گھنی بارش کی آمد کی امید اور پھر برسات کے بعد ریگستان میں رومانی کیفیت گویا اب بھی میری نس نس میں رچی بسی ہے۔ اور نیویارک میں میری اس سے بڑی اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی کہ میں سینٹرل پارک کے عین کنارے پر رہتا تھا۔ جہاں رہنے کے لئے، جیسے میں نے پہلے کہا عام امریکی لوگ محض خواب دیکھتے تھے۔

میں ہر روز صبح صبح اپنا جوگنگ سوٹ پہن کر سینٹرل پارک میں نکل پڑتا۔ اور پھر ہرے بھرے درختوں، پھولوں سے لدی جھاڑیوں کیاریوں اور مصنوعی جھیلوں کے بیچ دیر تک کچھ ٹہلتا اور کچھ دوڑتا رہتا۔ ہلکی ہلکی برسات کی پھوار، پرندوں کی بھرمار اور گہری ہری گھاس کی بھینی خوشبو اور ان کی نرم و نازک پتیوں پر ہیروں کی کنیوں کی طرح جڑے ننھے ننھے اوس کے قطرے، مجھے ایک دفعہ پھر بچپن کی ساون بھری لطافتوں میں ڈبو دیتے۔ میں آنکھیں موند لیتا اور پھر خواب کی سی کیفیت میں پاس کی بنچ پر جابیٹھتا پھر نہ جانے کہاں سے کوئی میٹھی اور مدھر دھن، دھیرے دھیرے میرے کانوں میں گونجنے لگتی۔

"گھٹا گھنگور ۔ گور، مور مچائے شور
مورے سجن آجا....."

یا پھر "پاپی پپیہارے ۔ پی پی نہ بول بیری پی پی نہ بول۔"

ہاں بچپن کی یادیں اور اپنی ثقافتی جڑوں سے وابستگی غالباً" اجڑ جانے کے بعد انسان کا سب سے بڑا المیہ نہیں تو اثاثہ ضرور بن جاتی ہیں۔ چھٹی کے دن پارک کے عین بیچ ایک بڑے سے چوک پر افریقہ نژاد شیدی جمع ہوجاتے جو بڑے بڑے کیسٹ پلیروں پر اونچی آواز سے اپنی مخصوص موسیقی بجا کر سکیٹنگ کرتے ہوئے ناچتے اور مجھے شیدیوں کے ناچ بہت ہی بھلے معلوم ہوتے۔ ان کے یہ ناچ گانے سندھ کے شیدیوں کے ناچ گانوں سے کوئی زیادہ مختلف نہیں تھے۔ اور میں ان میں اتنا محو ہوجاتا کہ گھنٹوں وہاں کھڑا ڈھول کی تال پر بدن جھٹک کر سر ہلانے کی کوشش کرتا۔ امریکی شیدیوں کے یہ ناچ روح کے ناچ کہلاتے۔ سندھ کے شیدیوں کے ساتھ ناچتے ہوئے بھی مجھے یہی احساس ہوتا تھا کہ شیدیوں کی ثقافت میں ناچ و موسیقی روحانی کیفیت کی حامل ہے۔

ایک ایسے ہی سہانے دن فصیح خالدی اور میں دیر تک پارک میں گھومتے رہے اور پھریکایک فضا میں تھرتھراتی افریقی ڈھول کی آواز چبوترے نما چوک کی سمت سے گونجنے لگی۔ میں نے کہا۔

”فصیح، چلو، آج ہم شیدیوں کے ساتھ مل کر ناچتے ہیں۔“

”ہم، امریکی شیدیوں کا ناچ کریں گے!“ فصیح نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیوں نہیں؟“ میں نے کہا۔ ”پوری ایک دہائی میں نے سندھ کے شیدیوں کے ساتھ کام کرتے بتائی ہے۔ ان کے ساتھ رات رات بھر روح کا ناچ کیا ہے۔ وہاں اس ڈھول کو مگرمان کہتے ہیں اور اس کا بڑا تقدس اور مان ہے بلکہ میں ان سے اتنا قریب رہا ہوں کہ سندھ کے بیشتر شیدی اپنائیت میں مجھے بھی شیدی تصور کرتے ہیں۔ چلو آج میں تمہیں ان کی ایک جھلک دکھاتا ہوں۔“

”مگر وہ تو سندھ کے شیدی ہیں امریکہ کے ساتھ ان کا کیا میل؟“ فصیح نے بحث جاری رکھی۔

”ہاں، آج میں تم کو یہی دکھلانا چاہتا ہوں کہ شیدی بنیادی طور پر افریقی ہے۔ خواہ وہ سندھ میں ہو یا امریکہ میں ان کی بنیادی ثقافت میں کوئی فرق نہیں۔“

”عین اس وقت مجھے اپنا پرانا دوست فیضو شیدی یاد آیا۔ شروع شروع میں جب میں سندھ کے شیدیوں کے ساتھ روح کے ان ناچوں میں شریک ہوتا تو مجھے ان کی ابجد کا بھی پتہ نہیں تھا اور میں بہت ہی اناڑی پن کا مظاہرہ کرتا۔

”بھائی جان، تم راجپوت ہو۔“ فیضو مجھے پیار سے بھائی جان کہتا۔

”جاگیردارانہ ذہن کے راجپوت تو مجرے کی محفل گرمانا جانتے ہیں۔ کوڑے کے بل پر رنڈیاں نچاتے ہیں۔ ان کو ناچنے کا کیا پتہ۔ ناچنے کے لئے روح چاہئے بھائی جان! اور جاگیرداروں کی روح مرجاتی ہے۔ جاؤ پہلے اپنی کھوئی ہوئی روح کو تلاش کرو۔ پھر دیکھنا کیسا ناچتے ہو۔“ فیضو مسخرے پن میں اونچا قہقہہ لگاتا اور میں شرم کے مارے پانی پانی ہوجاتا۔ پھر میں بھی سنبھل کر اسی مسخرے پن میں جواب دیتا۔

”فیضو، تم ڈھول کی طرح پھولتے جارہے ہو۔ شاید اسی لئے تمہارا ناچنے کا جذبہ بھی ماند پڑ گیا ہے۔ لگتا ہے تمہاری روح بھی اب بھٹکنا شروع ہوگئی ہے۔ مگر میں اپنی

کھوئی ہوئی روح ضرور تلاش کروں گا اور تب فیفو میں تم کو اس رُوحانی ناچ میں نچا دکھاؤں گا۔ یہ یاد رکھنا۔"

اس بات کو اب دس برس بیت رہے تھے۔ مگر اس عرصہ میں میں نے روح کی تلاش اور ناچنے کے جذبے کو قائم رکھا تھا۔ اور آج میں امریکی شیدیوں کے بیچ جو ناچ کا مظاہرہ کرنے والا تھا، حقیقت میں فیفو شیدی کے لئے ہی تھا۔

جب ہم ناچتے شیدیوں کے جمگھٹے کے قریب پہنچے تو میں نے فیفو کو یاد کرکے دل ہی دل میں کہا۔ "کاش تم یہاں موجود ہوتے، تو میں تمہیں دکھلاتا کہ میں نے اپنی کھوئی ہوئی روح کو بلاخر ڈھونڈ نکالا ہے۔ دیکھو آج میری روح دھرتی کے کچلے ہوئے انسانوں کے ساتھ تال ملا کر ناچ رہی ہے۔ ان میں مدغم ہوگئی ہے۔" میں زور سے قہقہ لگا کر ہنسا۔

"کیوں؟ کیا ہوا خورشید، تم کس پر ہنس رہے ہو؟" فصیح نے حیران ہوکر پوچھا۔

"نہیں، نہیں کچھ بھی نہیں۔ میں کبھی کبھی خود کلامی میں بڑبڑاتا ہوں۔" اب ہم گول دائرے میں کھڑے مجمع سے جاملے اور بیچ میں گھرے پلیٹ فارم پر شیدی ناچ رہے تھے۔ اور یہ شیدی نیویارک کی تنگ گلیوں کے منجھے ہوئے ناچو تھے۔ جب میں بوجھل قدموں سے دھیرے دھیرے چلتا ان کے بیچ پہنچا تو مجھے یوں لگا جیسے پورے نیویارک شہر کی نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ میں نے ایک کونا سنبھال کر لمحہ بھر کے لئے آنکھیں موند لیں اور ناچ کی دھن جو پہلے ہی میری روح کو جھنجوڑ رہی تھی، اب میرے انگ انگ سے پھوٹ پڑی۔ ہاتھ، پیر، بدن، کولھے، سر غرض یہ کہ ہر عضو اپنے اپنے محور میں گردش کرنے لگا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک شیدی لڑکی میرے ساتھ جوڑ ملا کر ناچ رہی تھی۔ پھر گھنٹوں میں وجد آور کیفیت میں ناچتا رہا۔ یہاں تک کہ محفل اختتام کو پہنچی۔ جب میں باہر آیا تو فصیح خالدی فرط جذبات میں مجھ سے لپٹ گیا۔

"یار، تم نے تو کمال کردیا۔ ارے تم تو بہت سارے شیدیوں سے بہتر ناچ رہے تھے۔ یہ سب تم نے کب اور کیسے سیکھا؟" فصیح اب خوشی کے مارے ناچ رہا تھا۔

"یقین ماننا، میں نے اپنی پوری بیس سالہ امریکی زندگی میں کسی پاکستانی کو اس طرح

سرعام شیدیوں کے بیچ ناچتے نہیں دیکھا۔ میں تمہیں بتلا نہیں سکتا مجھے تم پر کتنا فخر محسوس ہوا۔ عظیم، تم بہت عظیم دکھائی دیئے۔ اور تمہارا انداز" .... فصیح دیر تک جذباتی ہو کر چہکتا گیا۔

مگر میں اپنے تئیں مطمئن نہیں تھا۔ شیدیوں کی طرح ناچنے کے لئے ابھی مجھے بڑی ریاضت کی ضرورت تھی۔ مگر ایک بات صاف تھی کہ اب میری روح بھرپور طور پر مجھ میں زندہ تھی۔

(۱۰)

کافی شاپ

آدمی نے اپنے گرد چھوٹے چھوٹے ہیولے بن رکھے ہیں۔ ہر کوئی اپنے دائرے میں رہتا ہے۔ اس کی سوچ اکثر اوقات اپنے خود ساختہ دائرے سے متعلق ہوتی ہے، مگر پھر بھی ہر کوئی اپنے آپ کو سچائی سے قریب ترین سمجھتا ہے۔ وہ اپنے خدا کو دوسروں کے خداؤں سے برتر گردانتا ہے اور اس ایمان کے لئے ہروقت مرنے مارنے پر تلا رہتا ہے۔ مذہب، طبقہ، قوم، قبیلہ، زبان اور خاندان کے نام پر کتنے ہی دائرے ہیں جن میں بیٹھ کر حقیقت میں [illegible] نہ صرف اپنے ذاتی مفادات کی حفاظت کرتا ہے بلکہ ان کو دوسروں پر تھوپنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ خدا نے کیا ایک آدم پیدا اور آدمی نے گھڑ دیئے لاکھوں خدا۔

میں نے اپنے اطراف کے بیشتر چھوٹے چھوٹے دائرے توڑ ڈالے ہیں۔ مگر ایک دائرہ ایسا ہے جسے میں نے بھی قبول کرلیا ہے اور وہ ہے انسانیت اور پیار کا دائرہ۔ اس کے اندر بیٹھ کر میں نے اپنے اندر کے خودپرست آدمی سے چھٹکارا حاصل کرلیا ہے۔ پھر میں سوچتا ہوں کہ ان الفاظ کے سہارے کیا میں دوسروں کی طرح اپنے آپ کو دھوکا تو نہیں دے رہا؟ کیونکہ جب تک میرے گرد ایک بھی دائرہ قائم ہے میں دوسروں سے مختلف کیسے ہوسکتا ہوں۔

نیویارک میں جب بھی آپ کسی شخص کے سامنے ھارلیم کا نام لیں تو فوراً اس کی بھنویں تن جاتی ہیں۔ یا پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلے گا۔ ”خیال رکھنا اپنا، ذرا دھیان سے چلنا“۔ یہ الفاظ اتنے میکانکی طور پر ادا کئے جاتے ہیں کہ سننے والے کو

یوں لگتا ہے، جیسے چاروں اوڑ کی دیواریں بول پڑی ہوں۔ "ذرا دھیان سے......"

ایک دن ھارلیم میں گھومتا گھماتا، ۱۲۵ اسٹریٹ پر میں Legs لیگز نام کی ایک چھوٹی سی کافی شاپ میں داخل ہوا۔ شاپ کے باہر بورڈ پر دو لمبی اور سڈول اور نیم عریاں نسوانی ٹانگیں بنی تھیں جو رانوں سے اوپر پراسرار طور پر غائب تھیں۔ میں اندر داخل ہوا تو ایک بوڑھے ڈاڈا شیدی نے پر تجسس نگاہوں سے گھور کر میرا استقبال کیا۔ ڈاڈا اس ریستوران کو چلاتا تھا۔ اس کی ناک چوڑی اور چپٹی، رنگ سیاہ، موٹے ہونٹ اور سرمنڈا ہوا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ ساٹھ کی دہائی میں ہو۔ جب میں ایک سٹول کھینچ کر ڈاڈا کے کاؤنٹر کے سامنے بیٹھا تو میری نظر اس کے پیچھے کی طرف دیوار پر ایک نوٹس پر پڑی۔

I don't give a shit

I don't take any shit

I am not in the shit business.

اگر میں ملائمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دوں تو اس کا مطلب ہو سکتا تھا کہ

"نہ میں گند کرتا ہوں
نہ میں گند اٹھاتا ہوں
گند کرنا، میرا دھندا نہیں ہے۔"

"کیا کھاؤ گے؟" اس نے خمار بھری آنکھوں سے کچھ دیر مجھے گھور کر ملائمت سے پوچھا اور میرا جواب سنے بغیر دھیرے دھیرے جھومتا دوسری طرف چلا گیا جہاں چند ایک گاہک چلا چلا کر کچھ مانگ رہے تھے۔ اس کی چال ڈھال سے یوں لگتا تھا جیسے اسے اس کام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اکثر اونچی آواز میں بڑبڑا کر کہتا:

I dont have none.

میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

جب وہ میرے پاس دوبارہ آیا تو میں نے ایک "پنیر برگر" اور کافی کی پیالی کا آرڈر دیا۔ وہ آہستگی کے ساتھ چولہے پر چیزیں تیار کرنے لگا۔ ایک طرف کونے میں ریڈیو لگا تھا، جس پر دھیمے اور میٹھے سروں میں "Jazz" جاز موسیقی کی دھن جاری تھی۔ کبھی

کبھی اس کی لے پر ناچنے لگتا۔ پہلی نظر ڈالنے پر، وہ بوڑھا شیدی مجھے بہت بھلا انسان دِکھائی دیا۔

”انڈین؟“ اس نے کافی بھرا مگ میرے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

”پاکستانی، مگر ایک ہی بات ہے۔“ میں اس سوال کا ہمیشہ یہی جواب دیتا ہوں، اس لئے کہ مجھے اپنی تاریخ کے اس گھناؤنے باب کو چھیڑنے میں خاصی روحانی تکلیف پہنچتی ہے۔

”ہاں، ہاں! مجھے معلوم ہے۔ یہاں بنگلہ دیشی بھی آتے ہیں۔ دشمنوں نے تمہارے تین ٹکڑے کردیئے ہیں۔“ اس نے دانشوروں کی سی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”تمہارا کیا نام ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”والیس“ اس نے افریقی چٹخارے کے ساتھ کہا۔

میں نے کہا ”والیس، یہاں کے لوگوں کا تو جغرافیہ بھی خاصہ کمزور ہوتا ہے۔ مگر حیرت ہے کہ تمہیں تو ہماری تاریخی تقسیم کے المیے کا بھی علم ہے؟“

”میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے۔“ اس نے اپنے منڈے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔“ میں نے پچھلے چالیس سال سے یہی کام وال اسٹریٹ Wall street پر کیا ہے۔ تمہیں معلوم ہوگا نیویارک کی وال اسٹریٹ پوری دنیا کے بیوپار کو کنٹرول کرتی ہے۔ میں نے دنیا بھر کے مہاجنوں کو وہاں کھانا کھلایا ہے۔“ اس نے بوڑھے مرغے کی طرح اکڑ کر کہا۔

”مگر والیس، تمہاری مونچھوں کا تو ایک بھی بال سفید نہیں ہے“! میں نے ہنس کر کہا۔

”میری عمر سڑسٹھ سال ہے۔ میں یونین کا آدمی بھی رہا ہوں۔ اب پنشن پر ہوں۔ یہ نوکری تو بس یوں ہی وقت گزارنے کے لئے کرتا ہوں۔“

اس پر مجھے شیدیوں کے بارے میں ایک سندھی زبان کی کہاوت یاد آئی۔

”سندھی جیبی سجی جمار، شیدی جو ھک وار۔“

مطلب کہ سندھی کی کل عمر گزر جانے پر شیدی کا صرف ایک بال سفید ہوتا ہے۔

جب میں نے والیس کو یہ کہاوت سنائی تو بہت ہنسا۔ اور پھر سندھ کے شیدیوں کے بارے میں سوال پوچھتا رہا۔

"کیا تمہارے ہاں بھی ھارلیم ہے؟"

"ہاں کراچی میں ہمارے ھارلیم کو 'لیاری اور بغدادی' کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تو کیا وہ سب بھی چور' ڈاکو اور تشئی ہیں؟" والیس نے اداس انداز میں کہا۔

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" میں نے احتجاجاً" کہا۔ "کیا ھارلیم میں سب چور' ڈاکو رہتے ہیں؟"

"اس بوڑھے نیگرو کا دماغ چل گیا ہے۔ کیونکہ اس نے ساری عمر گورے لوگوں کی چکنی' چوپڑی پکانے اور کھانے میں گزار دی ہے۔" ایک ادھیڑ عمر کی شیدی خاتون نے اسٹول کھینچ کر میرے بازو میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ غالباً" کچھ دیر سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔

"ہاں ھارلیم کے لوگ چوری بھی کرتے ہیں اور ڈاکے بھی ڈالتے ہیں۔ اس لئے کہ نیویارک جیسے امیر ترین شہر میں ان لوگوں کے لئے نہ کوئی نوکری ہے' نہ تعلیم اور نہ ہی کسی قسم کا تحفظ۔ یہ بھوک سے بلکتے لاکھوں لوگ کیا بلک بلک کر مرجائیں۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں بھی کرتے ہیں محض زندہ رہنے کے لئے۔ اصل چور اور بڑے بڑے ڈاکو تو گورے لوگ ہیں جو ان سب لوگوں کی محنت لوٹ کر کروڑوں روپے جمع کرلیتے ہیں۔ یہ ملک گورے لوگوں کا نہیں تھا۔ والیس کیا وہ ڈاکو نہیں ہیں جنہوں نے ریڈ انڈین لوگوں کی نسل کشی کرکے ان کے ملک پر ہمیشہ کے لئے قبضہ جما لیا۔ ان کو ڈاکو کیوں نہیں کہتے والیس؟" وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بے تکان بولے جارہی تھی۔

"اور یہ ھارلیم کس نے بسایا؟ کیا یہ شیدی لوگ اپنی مرضی سے یہاں آئے تھے؟ اصل مجرم تو گورے لوگ ہیں جو نہ صرف یورپی جیلوں اور کلیساؤں سے نکل کر یہاں آئے بلکہ اپنے ساتھ افریقہ سے لاکھوں لوگوں' بچوں اور عورتوں کو بھی غلام بنا کر اپنے ساتھ لائے۔ اور اب اپنے لئے تو علیحدہ گوری جنت بنائی ہے اور بیچارے شیدیوں کو ھارلیم جیسی دوزخ میں دھکیل دیا ہے۔"

جب وہ ذرا دیر کے لئے رکی تو اس کے منہ سے جھاگ ابل رہے تھے۔ اتنے میں کچھ اور لوگ شاپ میں آگئے اور والیس ان کی خاطرداری میں لگ گیا۔ وہ کچھ دیر سانس لے کر میری طرف رجوع ہوئی۔

"تم کس ملک کے ہو؟"

"پاکستان، انڈیا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا تمہارے ملک میں بھی کالے لوگ ہیں؟"

"ہاں بہت، ہزاروں کی تعداد میں"

"اچھا! وہاں کیسے پہنچے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"بالکل اسی طرح سے، جیسے تم لوگ یہاں پہنچے" میں نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تمہارے ملک میں بھی گورے لوگوں کا قبضہ ہے؟ میرا خیال تھا کہ انڈیا، پاکستان کے لوگ تو خود کالے اور بھورے لوگ ہیں۔" میں نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔

"ہمارے ہاں حقیقت میں تو گورے لوگ نہیں ہیں۔ مگر گوری ذہنیت کے لوگ ہیں۔ بس ایسے ہی جیسے تمہارے ہاں انکل، ٹام ہوتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اپنے آپ کو باہر سے آئے حملہ آوروں کی اولاد تصور کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو عام لوگوں کے مقابلہ میں اعلیٰ ذات حاکم النسل سمجھتے ہیں۔ بالکل یہاں کے اینگلو سیکسن لوگوں کی طرح اور وہ پاک ہند کے قدیم باشندوں کو کالا، کلوٹا اور نیچ ذات تصور کرتے ہیں۔" میں نے سامنے رکھی ہوئی کافی کا ایک گھونٹ لیا۔

"تو یہ کالے ہندوستانی کون ہیں؟" اس نے مزید دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارے ملک کے قدیم باشندے ہیں جنہیں ہم تاریخی طور پر شناخت کے لئے دراوڑ یا قدیم قبائل بھی کہہ دیتے ہیں۔ ان ہی لوگوں نے کوئی ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں وادی سندھ کی تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی۔ بہت مہذب اور پرامن لوگ تھے۔ موہن جوداڑو اور ہڑپہ نام کے پاکستان میں دو شہر جو کھدائی کے ذریعہ زمین سے نکلے ہیں اسی تہذیب سے متعلق ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان شہروں میں آریاؤں کا

نام و نشان تک نہیں ملا۔ قدیم مصر اور سومیریا کی تہذیبوں کی طرح وادی سندھ کی تہذیب بھی کالے لوگوں کی تہذیب تھی۔"

اتنے میں والیس لمحہ بھر کے لئے فارغ ہو کر آیا اور ہم سے رجوع ہوا۔

"کیا یہ غلط ہے کہ ھارلیم میں بڑے پیمانے پر ڈرگ کا کاروبار ہوتا ہے لوگ بھیک مانگتے ہیں اور عورتیں رنڈیوں کا دھندا کرتی ہیں؟" والیس نے بھی جذباتی ہو کر کہا۔

"ذرا ٹھہرو والیس!" خاتون نے اپنے سامنے رکھا ہوا اخبار جس کا نام "کالا امریکن" تھا اٹھایا اور میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا نام بتلایا تم نے کھان؟ مسٹر کھان اسے غور سے دیکھو ذرا۔" میں نے دیکھا اخبار کے پہلے صفحہ پر ایک جوان سال خوبصورت شیدی لڑکے کی بڑی سی تصویر چھپی تھی جس کا نام عبدالحکیم تھا۔ میں اس کے متعلق خبر پڑھ رہا تھا کہ خاتون بولنا شروع ہو گئی۔

"گوری پولیس نے اسے جیل میں بند کر رکھا ہے اور تشدد کے ذریعہ اسے قتل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کیونکہ اس نوجوان نے ھارلیم میں گوری پولیس کے ہاتھوں ڈرگ (چرس، کوکین، ہیروئن) سپلائی کرنے کے ریکٹ سے متعلق راز فاش کردیا ہے۔ جب یہ نوجوان کمسن اور معصوم تھا تو پولیس نے اس کو ڈرگ ریکٹ کے لئے استعمال کیا۔ اور اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جیلوں میں گزرا۔ اتفاق سے بہت سے دوسرے قیدیوں کی طرح یہ نوجوان بھی کالا مسلمان بن گیا۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ کالے مسلمانوں کی تحریک جیلوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اور جب اسے قومی شعور حاصل ہوا تو اس نے ھارلیم میں پولیس کے ذریعہ ڈرگ سپلائی کے خلاف جدوجہد شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر جھوٹا الزام لگا کر اسے جیل میں ڈال کر اس پر تشدد کیا جارہا ہے تاکہ وہ اپنا منہ بند رکھے۔ اور اگر اس کا منہ بند نہیں ہوا، جو مجھے یقین ہے کہ نہیں ہوگا کیونکہ کالے مسلمان بہت لڑاکے لوگ ہیں اور اس وقت ھارلیم کو جرائم سے پاک کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں تو اسے قتل کردیا جائے گا۔ کالے مسلمانوں کے مشہور لیڈر میلکم ایکس کا قتل یاد ہے آپ کو؟

"اب تم ہی بتلاؤ، مسٹر کھان (خان) اصل مجرم کون ہیں؟ ھارلیم کے کچلے ہوئے غریب لوگ یا گوری حکومت کے کارندے خود؟"

اس پر مجھے کراچی کی لیاری اور بغدادی میں پولیس اور نوکر شاہی کی حفاظت میں ڈرگ مافیا کی حرکتوں کا خیال آیا جو کمیونٹی کے سوشل ورکروں کو قتل بھی کرتے تھے اور جھوٹے الزام میں لوگوں کو جیلوں میں بند بھی رکھتے تھے۔ مجھے ان نقاب پوش موٹر سائیکل سوار نشانہ بازوں کا بھی خیال آیا جو بے گناہ لوگوں کو دن دہاڑے قتل کرتے تھے اور کبھی پکڑے بھی نہیں جاتے تھے اور جو لوگوں میں خوف و حراس پھیلا کر ان کو آپس میں لڑائے رکھنے کی سازش کرتے تھے

اور اب مجھے وہ گتھی بھی سمجھ میں آئی کہ ضیاء کے دور حکومت میں کس طرح فوجی جرنلوں اور حکومت کے دوسرے اعلیٰ افسروں کی سرپرستی میں ملین ڈالر کی ہیروئن کی تجارت نے نہ صرف جنم لیا بلکہ اپنی انتہا کو پہنچی۔ اور یہ کہ اس زمانہ کی امریکی حکومت نے اسے روکنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ کیوں کہ اگر وہ ایسا کرتی تو پاکستان کو افغانستان کی جنگ میں فرنٹ لائن کے طور پر استعمال کرنے کا سلسلہ کھٹائی میں پڑ سکتا تھا۔ اس لئے قیاس ہے کہ امریکہ میں سی۔ آئی۔ اے کے ایجنٹ ملک سے باہر خود ہی یہ ڈرگ خرید لیتے اور پھر ہارلیم جیسی غریب بستیوں میں پھیلا کر انہیں ناکارہ بنا دیتے۔ یعنی ایک پنتھ اور دو کاج۔ اور اب یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں تھا کہ ضیاء حکومت نے کیوں شراب اور افیون پر تو پابندی لگا دی مگر ہیروئن کی تجارت کو فروغ دیا۔

کراچی اور حیدر آباد کے لسانی دنگے اور فسادات میں ایجنسیوں کی سرپرستی میں اور بہت سے طریقہ واردات کے ساتھ ساتھ ڈرگ اور ٹرانسپورٹ مافیہ کا بہت بڑا ہاتھ بھی رہا ہے۔ میں نے اس شیدی خاتون کو جس کا نام ایتھوپیہ تپاہ تھا یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ایہ! تم پڑھے لکھے لگتے ہو۔ کیا کرتے ہو؟" ایتھوپیہ نے ملائمت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس مجھے بھی وہاں کا کالا مسلمان ہی سمجھ لو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تھوڑا بہت آزاد صحافی کے طور پر لکھ لیتا ہوں۔"

"تو کیا وہ تم کو یہ سب کچھ لکھنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ کیا تمہاری جان کو خطرہ لاحق نہیں ہوتا؟" اس نے ہمدردانہ انداز میں پوچھا۔

"خطرہ تو ہر وقت رہتا ہے۔" میں نے اسے بتلایا کہ محض چند ماہ قبل، جب میں

حیدر آباد شہر میں رہتا تھا تو ایجنٹوں نے میری غیر موجودگی میں خفیہ طور پر میرے گھر پر چھاپہ مارا۔ بہت سی چیزیں اٹھا کر لے گئے مگر مجھے پکڑنے کے لئے کچھ نہیں ملا۔ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ وہ خود ہی میری رہائش میں کچھ الابلا پھینک کر ڈرامہ رچائیں مجھے وہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ اور میں نے وہ جگہ چھوڑ دی۔

"ہمارے ترقی پذیر ممالک میں گوری ذہنیت رکھنے والے جنہیں ہم جدید نو آباد کار بھی کہتے ہیں، سنگدل، بے حس اور انتہائی بدکار طبقات حکمرانی کرتے ہیں۔ تمہارے ہاں تو ہارلیم ایک غریب بستی کا نام ہے۔ مگر ہمارے ہاں، تیسری دنیا میں تو ملک کی کل آبادیوں کو ہارلیم میں منتقل کردیا گیا ہے۔ اور ہمارے یہ ظالم اور بدکار حکمران طبقات تمہاری گوری حکومت ہی سے جلا حاصل کرتے ہیں۔ ان دونوں ہی فریقوں کا مفاد ترقی پذیر ممالک کے عوام کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور لڑاؤ اور تقسیم کرو، کی پالیسی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔"

اس دوران والیس شیدی کو جب موقع ملتا لمحہ بھر کے لئے چپ چاپ کھڑا ہماری گرما گرم باتیں سنتا رہا۔ بہت ہی سیدھا سادہ بے ضرر سا انسان دکھائی دیتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے بہت شفقت بھری نگاہوں سے گھورنے لگتا۔ ایتھوپیہ نے مجھے اپنا پتہ لکھ کر دیا اور کہا کہ ہارلیم میں کچھ صحافی لوگ اس کے واقف ہیں اور مجھے ان سے ملوائے گی اور جب اٹھ کر جانے لگی تو کہا۔

"ہاں، پاکستان سے میرے شیدی لوگوں کی تصویریں مجھے ضرور بھیجنا۔" جب وہ چلی گئی تو والیس نے شرارت بھری نظروں سے مجھے گھور کر کہا۔

"مسٹر کھان (خان)! میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کوئی بری عورت تھی۔ مگر جب بھی ہارلیم میں کوئی عورت تم کو گھر بلائے، تو تم ہر وقت اپنی نظر اپنے بٹوے پر رکھنا۔" اور پھر وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

میں نے بھی اسی پرمزاح انداز میں جواب دیا۔ "والیس میں تو وطن سے صرف دو سو ڈالر جیب میں ڈال کر نکلا تھا، جن سے تم جانتے ہو، نیویارک میں ہفتہ گزارنا بھی مشکل ہے۔ لہٰذا نہ تو میری جیب بھری رہتی ہے اور نہ ہی کسی عورت نے آج تک گھر آنے کی دعوت دی ہے اور نہ ہی میں کسی ایسی دعوت کا منتظر رہتا ہوں۔ ڈاڈا، تم

اس کی بالکل فکر مت کرو۔"

"تم بھلے آدمی دکھائی پڑتے ہو۔ میرے جیسا بھلا آدمی بھی تمھکو ھارلیم میں ڈھونڈنے سے ہی ملے گا۔ بس تم یہاں آجایا کرو۔ تم لکھنے پڑھنے والے آدمی ہو، تم کو یہاں بھانت بھانت کے کردار ملیں گے۔" والیس نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

جب تک میں نیویارک میں رہا، ایک آدھ دن کے بعد والیس شیدی کی' لیگز کافی شاپ' میں چلا آتا۔ کوئی ڈیڑھ ڈالر کا کھانا کھاتا اور گھنٹوں وہاں بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھی والیس کافی کی دوسری پیالی مفت پلا دیتا جو امریکہ جیسے ملک میں بہت غیر معمولی بات تھی۔

(۱۱)

امریکی کتے اور بلیاں

کتے اور بلیاں پالنا موجودہ امریکی معاشرہ میں بہت ہی مقبول مشغلہ ہے، خواہ بوڑھا ہو کہ جوان، عورت ہو یا کہ مرد، سڑکوں کے کنارے یا بڑے بڑے تفریحی پارکوں میں کتوں کی زنجیر ہاتھوں میں تھامے یہ لوگ کبھی خراماں خراماں اور کبھی تیز دوڑتے، کبھی کتا ان سے آگے اور کبھی وہ کتے سے آگے چلے جاتے ہیں۔ ساتھ کی شاہراؤں اور پاس کی گلیوں میں عموماً ایک نوٹس بورڈ نصب ہوتا ہے، Clean after your dog یعنی اپنے کتے کی غلاظت صاف کرتے چلیں۔ اس کام کے لئے وہ تھیلوں میں صفائی کا سامان یوں باندھ کر چلتے ہیں جیسے کوئی گود کے بچے کی ماں ہر وقت بچے کے گندا ہونے کے ڈر سے ساتھ رکھتی ہے۔

یہ کتے بھانت بھانت کے ہوتے ہیں۔ سفید، کالے، بھورے اور چتکبرے، کچھ ریچھ یا لگڑ بھگوں کی مانند بڑے بڑے اور بے ڈھنگے، تو کچھ چھوٹے چھوٹے، بھیڑ بکریوں یا بلیوں اور بندروں کے بچوں کی مانند۔ یہ کتے اپنے مالکوں کی طرح بھرپور شخصیت کا مظاہرہ کرتے۔ کچھ اداس آنکھوں کے ساتھ گردوپیش کی چیزوں کو مڑ مڑ گھورتے خاموشی سے چلے جاتے تو کچھ کھلنڈرے اور شرارت کے پرکالے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ سینٹرل پارک میں ایک اونچے مقام پر ایک پل پر کھڑا کتے اور مالک کا جوڑا بڑے انہماک سے سامنے پھیلی ہوئی جھیل کے نظارے میں محو تھا، کتے نے بھی اپنے اگلے دونوں پیر اٹھا کر پل کی ریلنگ پر یوں جما رکھے تھے جیسے مالک نے اپنی ہتھیلیاں۔ دونوں بہت سنجیدہ اور باذوق لگتے تھے۔

مالکان جس ذمہ داری اور باقاعدگی کے ساتھ ان کتوں کی دیکھ بھال، پرورش و نیز تعلیم و تربیت کرتے ہیں اتنی شاید تیسری دنیا میں لوگ اپنے بال بچوں کی بھی نہیں کرپاتے۔ یہ کتے کم سے کم اپنے مالکوں جتنا شعور ضرور رکھتے ہیں۔ پارک میں ایک چھتنار درخت کے سایہ تلے ایک بنچ پر بیٹھا جب میں یہ سطور قلمبند کررہا تھا تو ایک بڑا سا بھورا کتا اپنی مالکہ خاتون سے غالباً" زنجیر چھڑوا کر میرے پاس آیا اور سونگھ کر میری ڈائری کا جائزہ لینے لگا جیسے جاننا چاہتا ہو کہ میں اس کی تعریف میں کچھ لکھ رہا ہوں یا برائی میں۔

مگر ان لوگوں کے ساتھ ان کے اپنے بچے شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور اگر کوئی خاندان، چیختے شور مچاتے اور ہنستے ہنساتے بچوں کے ساتھ نظر آتا ہے تو لامحالہ وہ خاندان یا تو کالوں یعنی شیدیوں کا ہوتا اور یا پھر لاطینی امریکہ کے چکانوں کا۔ کہتے ہیں کہ گورے لوگوں کے یہاں عموماً" کم بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ تو شاید ان کے اپنے قدیم جغرافیہ اور اقتصادیات میں چھپی ہوئی ہو اور یہ کہ کالے اور بھورے لوگوں کے یہاں زیادہ بچے کیوں پیدا ہوتے ہیں اس کا راز بھی ان کی اپنی پرانی سر زمینوں سے تعلق رکھتا ہے۔ میں اس کی گہرائی میں نہیں جاؤں گا، مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ بیشترقدیم ملکوں میں لوگوں کی آبادی کا گنجان ہونا یا نہ ہونے کا انحصار ان کی زرخیزی یا بنجرپن سے ہوتا تھا صنعتی دور سے پہلے کم سے کم ایسا ہی تھا۔ ان کے علاوہ آپ کو بوڑھے مرد اور عورتوں کی نسل بھی نظر آئے گی جو طویل عمری کے باعث نہایت نحیف اور لاغر ہونے کی صورت میں Wheel Chair یعنی پہیہ دار کرسیوں میں یوں بیٹھے نظر آئیں گے جیسے Pram میں بیٹھے بچے ہوں جنہیں کالی اور بھوری عورتیں دھکیل کر پارک میں ٹہلاتی ہیں۔ یہ لوگ ہیں جو ریٹائرمنٹ کے بعد تنہا گھروں میں رہتے ہیں اور گورنمنٹ کا ویلفیئر ادارہ تاحیات انہیں پنشن دیتا ہے۔ ان کے علاج و معالجہ و نیز فلاح و بہبود کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان بوڑھوں کی اکثریت نے یا تو اپنی جوانی کتے اور بلیوں کے سہارے گزار دی ہوتی ہے یا پھر یہ جب بچے تھے تو بڑے ہوکر اپنی اپنی راہوں پر چلے گئے۔ اب کالی اور بھوری انائیں ان کی تنہائیوں کا آخری سہارا ہوتی ہیں اور یہ کالی اور بھوری عورتیں روزگار کمانے کی خاطر اپنے شیر

خوار بچوں کو گھروں پر ہی چھوڑ آتی ہیں اور اس حقیر سی رقم سے انہیں پالتی ہیں۔

خیر، ذکر تو کتوں کا ہو رہا تھا۔ یہ کتے اکثر اوقات اپنے مالکوں کی طرح اعلیٰ نسل کے ہوتے ہیں اور بھاری قیمت پر خریدے جاتے ہیں۔ مجھے ان دنوں بہن فرانسیسکہ نے بتلایا کہ جب اس نے جرمنی کی ایک کتا پال کمپنی سے Great Dane گریٹ ڈین' نامی اعلیٰ نسل کا کتا آرڈر کیا تو اس نے چار ہزار ڈالر مانگے' یعنی آج کل کے حساب سے ایک لاکھ بیس ہزار روپے۔ مگر کچھ دوسرے لوگ کتوں کو گود بھی لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مغربی صنعتی ترقی جہاں ایک طرف مادی اشیاء کی بہتات اور عیش و عشرت کی چیزوں کا انبار لگادیتی ہے وہاں دوسری طرف لوگوں کی معاشرتی زندگیوں اور خاندانوں کا شیرازہ بکھیر کر انہیں شدید تنہائی کے غاروں میں بھی دھکیل دیتی ہے۔ اس لئے بال بچوں کی طرح ناز و نعم میں پلے کتے اور بلیاں پالنا ان کے لئے محض فیشن ہی نہیں بلکہ ان کی ضرورت بھی ہے۔ امریکہ میں گورے لوگ جتنا خرچ اپنے کتے اور بلیوں پر کرتے ہیں یا فاضل کھانا Garbage' کوڑے کے طور پر پھینکتے ہیں وہ اس قدر ہوتا ہے کہ جس سے تیسری دنیا کے غریب لوگوں کو ایک وقت کا کھانا مل سکتا ہے۔

یہ خرچ کس قدر ہوتا ہے اس کی ایک چھوٹی سی مثال میں شیبا کی بلیوں سے دوں گا۔

شیبا نے بلیوں کے دو بچے جو ایک کالا تھا اور دوسرا سفید' اپنی سہیلی مونا سے گود لئے۔ جس دن میں اس سے ملنے گیا تو اس دن وہ ان بچوں کی نس بندی کروا کر ہسپتال سے واپس لائی تھی۔ نس بندی ظاہر ہے اس لئے کروائی کہ وہ بڑے ہو کر مزید بچے پیدا نہ کرسکیں۔ اس آپریشن کے لئے اسے ۱۵۰ ڈالر فی بلونگڑا فیس دینی پڑی تھی۔ البتہ اگر ان بلونگڑوں کی انشورنس کروائی ہوتی تو یہ خرچ کمپنی خود برداشت کرتی۔

کمرے کے ایک کونے میں ان بلیوں کے دو گھر بنے تھے۔ یہ گھر پلاسٹک کے دو بڑے بڑے ڈبوں سے بنے تھے اور ان کے بالائی اور نچلے حصہ میں فلٹر لگے تھے جو بلیوں کی غلاظت کی بو کو گھر میں پھیلنے سے بچاتے تھے۔ بلیوں کی ان رہائش گاہوں کا نام بوڈا بکس یعنی Booda Box تھا اور ان کی قیمت اس زمانہ میں فی بکس ۳۵ ڈالر تھی۔ ان بکسوں میں ایک خاص قسم کی مٹی بکھیر دی جاتی تھی جس کی ایک لیٹر کی تھیلی کی قیمت پانچ ڈالر تھی اور یہ تھیلی ہفتہ وار بدلنی پڑتی تھی۔

بازار کی دوکانوں میں کتے اور بلیوں کے لئے مخصوص کھانا دستیاب تھا جو انسانی غذا کی طرح حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق تیار کیا جاتا ہے اور لاکھوں ڈالر کے کاروبار پر مبنی ہوتا ہے۔ چونکہ جانوروں کا یہ کھانا انسانی کھانوں سے کچھ سستا ہوتا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی اس کی قلت پڑجاتی ہے۔ اس لئے کہ امریکہ کے غریب لوگ جانوروں کے لئے بنا ہوا یہ کھانا خود ہضم کرجاتے ہیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو پھر امیر لوگ اخباروں میں اشتہار دیتے ہیں کہ جانوروں کے تحفظ کی خاطر انسانوں کو یہ کھانا کھانے سے باز رکھا جائے۔ یہاں یہ کہنے کی بالکل ضرورت نہیں کہ امریکہ کے یہ غریب لوگ کون ہوتے ہیں۔

اس سے مجھے انقلاب فرانس کا واقعہ یاد آیا، جب فرانس کے غریب لوگ بھوک کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں بادشاہ فرانس کے محل کے سامنے "روٹی دو" کا نعرہ لگاتے پہنچے تو ایک شہزادی نے بالکونی سے یہ منظر دیکھ کر کہا۔

"اگر انہیں روٹی نہیں ملتی تو یہ لوگ کیک کیوں نہیں کھالیتے؟"

جب یہ بلیاں چھوٹی ہوتی ہیں تو ان کو Kitten Chow کیٹن چاؤ، نام کی ایک مخصوص غذا دی جاتی ہے جس کا ایک ڈبہ کوئی تین ڈالر کا ملتا ہے اور جو فی کس ایک ہفتہ تک کافی ہوتا ہے۔ جب بلیاں بڑی ہوجاتی ہیں تو ان کو دو قسم کا کھانا مہیا کیا جاتا ہے، یعنی خشک خوراک اور یا بھیگی خوراک۔ خشک خوراک، خاص کھانا یعنی Special Dinner کہلاتی ہے اور یہ ٹونا مچھی، مرغ گوشت، بھیڑ کا گوشت، ٹرکی، مرغی کی کلیجی اور دیگر سمندری خوراک کے مرکب سے تیار کی جاتی ہے۔ جبکہ بھیگی خوراک میں بھی اجزاء تو یہی ہوتے ہیں مگر یہ دودھ وغیرہ کے ساتھ ملا کر دی جاتی ہے اور اکثر ٹن کے ڈبوں میں دستیاب ہوتی ہے۔ اس خوراک کی قیمت کوئی ڈیڑھ ڈالر یومیہ فی کس پڑتی ہے جب میں وہاں تھا تو اخباروں میں جانوروں کی حفظان صحت کے متعلق ایک گرما گرم بحث چل رہی تھی، مثلاً کہ خشک خوراک سے بلیوں کے مسوڑھے خراب ہوجاتے ہیں۔ جن کے علاج کے لئے ڈاکٹروں کو منہ مانگے پیسے دینے پڑتے ہیں۔ اسی طرح کچھ دوسرے لوگوں نے شکایت کی کہ بھیگی خوراک میں چونکہ دودھ وغیرہ ہوتا ہے اس سے بلیاں موٹی ہوجاتی ہیں جس سے نہ صرف ان کی صحت خراب رہتی ہے بلکہ دل کے

دورے و دیگر بیماریوں کا خطرہ رہتا ہے۔ اور کچھ نے زور دے کر کہا کہ دودھ سے خاص کر بلیوں کو الرجی پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ٹیلویژن پر ایک نئے کھانے کی ایجاد کی خبر دی گئی جو خشک خوراک اور بھیگی خوراک کو ملا کر تیار کی گئی تھی' جسے غورمٹ خوراک کہتے تھے اور اسے بلیوں کی فینسی خوراک بتلایا گیا تھا۔ اس کا ایک پیکٹ چار ڈالر کا ملتا تھا۔ جب یہ خوراک بھی چل نکلی تو سمجھو کہ امریکی کروڑ پتیوں کی صفوں میں راتوں رات ایک اور کروڑ پتی کا اضافہ ہوگیا۔

اب جاں توڑ تحقیق کے بعد "لیکٹوز فری" Lactose Free خوراک تیار کی جارہی ہے جس سے بلی کے کھانوں کو دودھ اور الرجی سے پیدا ہونے والے خطرات سے پاک کردیا جائے گا۔ Treat for Cat کے نام سے ایک مٹھائی بھی تیار کی گئی ہے جسے بلیوں کی چاکلیٹ کہہ سکتے ہیں یہ گوشت اور انڈے سے بنائی جاتی ہے اور جن بلیوں کو بھوک کم لگتی ہے انہیں یہ کھلائی جاتی ہے۔

اس طرح بلیوں کی ڈرگ بھی ہوتی ہے۔ اگر کسی بلی کو نیند نہ آنے کی بیماری ہو یعنی انگیزا ئینا وغیرہ ہو تو Cat Nip "کیٹ نپ" نام کی گولی دی جاسکتی ہے جسے کھا کر وہ سکون سے سوجاتی ہیں۔ اسی طرح کچھ بلیاں بہت سست پڑجاتی ہیں ان کو تازہ دم اور کھلنڈرا بنانے کی بھی گولیاں ہوتی ہیں۔ شیبا چونکہ امریکہ کے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کی دونوں بلیوں کا خرچ کوئی ۱۵۰ ڈالر ماہوار ہے یعنی کوئی ۴۵۰۰ روپے مگر امیر امریکیوں کے کتے' بلیوں پر کتنا خرچ ہوتا ہے اس کا تو اندازہ لگانا بھی محال ہے۔ حال ہی میں شیبا کی ایک سہیلی کی بلی بیمار رہنے لگی۔ ڈاکٹر نے بتلایا کہ اس کو تبدیلی آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس نے اس بلی کو ہوائی جہاز کے ذریعہ نیویارک سے کیلفورنیا اپنی ماں کے پاس بھیج دیا۔ جس کے محض ٹکٹ پر ۵۰۰ ڈالر لگے۔ اس کے کپڑے لتے اور دیگر سامان سفر اس کے علاوہ تھا۔ ویسے کتوں کا خرچ بلیوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ بچوں کی طرح ان کے کھیل کود کا سامان' کھلونے' ان کے غسل اور صفائی کا سامان' جیسے کہ برش' ویکوم کلینز وغیرہ باقاعدہ خریدنے پڑتے ہیں اور ان کی ماہوار شاپنگ کم سے کم ۵۰ سے ۱۰۰ ڈالر تک ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ' کتے' بلی کی بیماریوں سے حفاظت کے طور پر وقتاً" فوقتاً" بلڈ ٹیسٹ

Blood Test اینٹی ٹیٹنس Anti Tetnus کے ٹیکے وغیرہ لگوانے پڑتے ہیں۔ بلڈ ٹیسٹ کی فیس پچیس ڈالر تک ہوتی ہے جبکہ انجکشن کے کوئی پچاس ڈالر دینے پڑتے ہیں۔ اگر بلی کے بال اڑنے لگیں تو ایک لوشن ملتا ہے جو صرف لائسنس والا ڈاکٹر ہی دینے کا مجاز ہے۔ ان دونوں کیتھی Cathy کی بلی کے دانت پیلے اور میلے پڑ گئے تو ڈاکٹر کے پاس لیجایا گیا اور اس نے ان کی صفائی کے ۸۰ ڈالر چارج کئے۔

ایک اور صاحب کے ہاں پتہ چلا کہ ان کی بلی کو گھاس پر لاپرواہی سے کھیلتے ہوئے پیروں میں معمولی سی موچ آگئی تو اسے ڈاکٹر کے پاس لیجایا گیا۔ ڈاکٹر نے اس کے پیروں اور پنجوں کو اینٹی سپٹک دوائیوں سے دھو کر صاف کیا۔ پٹی کی اور پھر انہیں ٹیپ کے ذریعہ مضبوط کرکے اوپر موزے پہنادیئے جن کے نیچے پنجوں کی حفاظت کے لئے ننھے ننھے پیڈ لگے تھے تاکہ بلی کو چلنے پھرنے میں درد کا احساس نہ ہو۔

غرضیکہ اس موضوع پر تو الگ سے ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ امریکی کتوں اور بلیوں کے لئے فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ اس مقام پر مجھے اپنی کتیا یاد آئی جس نے سندھ کے دیہات میں میرے آبائی فارم پر آوارہ پھرتے ہوئے ایک دن کمال ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اپنالیا تھا۔ میں پھر اپنی بچی کھچی روٹیاں باقاعدہ طور پر اسے دینے لگا۔ جس کے عوض [illegible] بھی اب رضاکارانہ طور پر میری مکمل غلامی میں آگئی۔ ہر وقت مجھ پر آنکھ رکھتی اور رات کے وقت چھت پر بیٹھ کر پہرہ دے کر چور ڈاکوؤں کے خلاف میری حفاظت کرتی۔ اور اب جب میں نیویارک میں تھا تو وہ بھیل کسانوں کے گھروں میں ایک ایک روٹی کے ٹکڑے کے لئے ترستی ہوگی اور گاؤں کے دوسرے کتوں کے ساتھ لڑتی بھڑتی ہوگی اور کسانوں کے ڈنڈے بھی سہتی ہوگی۔ نیویارک میں اسے یاد کرکے لمحہ بھر کے لئے میرا دل بھر آیا۔

(۱۲)

مونا بارنیٹ

اس کی آنکھیں گہری سیاہ، بال گھنگریالے اور رنگ گندمی تھا۔ وہ نرم و نازک، قدرے دراز قد یہودی نژاد لڑکی تھی۔ نیویارک میں جب میں پہلی بار اسے شیبا کے گھر میں ملا تو مجھے اس کی آنکھوں میں اداسی کی جھلک سی نظر آئی۔ گو وہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی مگر اس کی طبیعت میں بے حد خاموشی، سادگی اور انکسار بھرا ٹھہراؤ تھا۔ جب وہ چلی گئی تو میں نے شیبا سے کہا۔ "لگتا ہے تمہاری دوست مونا نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔

"ہاں، مونا کو بہت غیر معمولی اور انوکھے دکھوں کا سامنا رہا ہے، مگر تمہیں اس کا گمان کیسے ہوا؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

میں نے ازراہ مذاق کہا۔ "تمہیں تو پتہ ہی ہے۔ میں ریگستان کی پیداوار ہوں، اور ریگستان کی زندگی کہنا چاہیے کہ درد کے سمندر میں جنم لیتی ہے۔ اور کوئی بھی دکھی انسان دوسروں کے دکھ بھری زندگی میں آسانی سے جھانک سکتا ہے۔"

"اچھا! بڑی عجیب بات ہے۔ مجھے تو تمہاری ہر وقت کی ہلکی پھلکی باتوں اور ہنسنے ہنسانے والی عادتوں سے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ تمہیں بھی کوئی گہرے دکھ ہو سکتے ہیں۔" شیبا نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ شاید اس لئے بھی کہ ایک تو تم سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئیں اور دوسرے یہ کہ دکھوں کو سینے میں چھپا کر جینے والا انسان غالباً" ہنسی مذاق اور بے ساختہ قہقہوں کے ذریعہ ان دکھوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ خاص کر اگر وہ دکھ

بہت ہی ذاتی نوعیت کے ہوں تو۔"

"شیبا' تم اس کی باتوں کو سنجیدگی سے مت لینا۔ یہ ہمیشہ شاعرانہ انداز میں باتیں کرتا ہے اور کبھی سچی نہیں کرتا۔" اس کی والدہ نے چھیڑنے کے انداز میں کہا جو حال ہی میں گرمیاں بتانے پاکستان سے آئی تھیں۔

"تم سے تو بی آپا میں اس لئے سچی نہیں کرتا کہ تم بھی ہر وقت بچوں کی طرح معصومانہ باتیں کرتی ہو اور تم نے بھی زندگی کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ باتیں تو پھر انسان کو دیکھ کر ہی کی جاتی ہیں نہ۔" میں نے بھی چھیڑنے کے انداز میں جملہ کسا۔

"پھر وہی شرارت' ارے تم کیسے بھائی ہو' امریکہ میں بھی ...."

"اچھا' اچھا' اماں یہ جھگڑا اب ختم' اور خورشید تم آج ہمیں اپنے سینے میں چھپائی ہوئی ریگستانی داستان سناؤ۔" شیبا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں اپنی داستان پھر کبھی سناؤں گا۔ آج تو تم مونا کی داستان سنا ڈالو۔" میں نے بضد ہو کر کہا۔

"مونا کی داستان بہت پردرد ہے۔" شیبا بولنے لگی۔ "ہم مشرق کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے دکھ بہت نرالے ہیں۔ جبکہ مغرب کے لوگوں کو ہم محض سٹریو ٹائپ' سوپ اوپرا کے طور پر ہی دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ تو جنت کی سی زندگیاں گزارتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے دکھ ان کے اپنے ماحول کے حوالے سے ہوتے ہیں مگر ہمارے لوگوں کے آلام و مصائب سے کسی قدر کم نہیں ہوتے۔ اچھا باتیں تو ہوتی رہیں گی پہلے یہ بتلاؤ کہ کیا پیو گے؟ شیبا اٹھ کر کچن میں گئی اور کچھ پینے کے لئے مشروب لے آئی۔

اس نے باتوں ہی باتوں میں دو ایک گھونٹ بھرے اور پھر اس کے چہرے پر گھمبیرتا چھاگئی اور وہ رک رک کر بولنے لگی۔ جیسے ایک ایک لفظ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاتال سے نکال رہی ہو۔

"یہ غالباً" نومبر ۱۹۵۹ء کا ذکر ہے جب مونا کی ماں ۱۸ سال کی ایک خوبرو طالبہ تھی۔ یونیورسٹی میں اس کی ایک ہم جماعت طالب علم کے ساتھ گاڑھی چھننے لگی۔ دونوں جواں سال اور حسین تھے۔ ظاہر ہے کہ شادی بیاہ کے وعدے وعید بھی ہوئے ہوں

گے۔ مگر آج کل کے مقابلہ میں اس زمانہ میں معاشرہ خاصہ رجعت پرست تھا اور نوجوان نسل کو جنسی آزادی میسر نہیں تھی جو آج کل ہے۔ پھر بھی مونا کی ماں دانستہ یا نادانستہ بن بیاہے حاملہ ہوگئی۔ اس کا باپ وکیل تھا مگر یہودی نژاد ہونے کے حوالے سے ماں اور باپ دونوں ہی شادی کے معاملہ میں خاصے پرانے خیال کے تھے انہوں نے سقوط حمل سے تو اختلاف کیا۔ مگر بیٹی پر زور دیا کہ وہ ہسپتال میں بچہ جنے اور پھر اسے بچوں کو گود لینے والی کسی تنظیم کے حوالے کردے۔ اس طرح ایک رات مونا اپنی ماں کی کوکھ سے نیویارک کے ایک ہسپتال میں پیدا ہوئی۔"

"بیوقوف کہیں کی۔ شادی ہی کرلیتی تو کیا تھا۔" بی آپا نے جو خود جوانی میں بیوہ ہوئی تھیں اور زندگی بھر دوبارہ شادی نہیں کی تھی۔ آہ بھر کر کہا۔

شیبا نے ماں کی طرف معنی خیز نظروں سے گھورا اور پھر گویا ہوئی۔

"مونا اپنی ماں سارہ کے پہلو میں بمشکل ایک گھنٹہ ہسپتال کے بستر پر رہی ہوگی۔ اور پھر اسے لورا بارنیٹ کا نام دے کر ایک فلاحی تنظیم کے حوالے کردیا گیا۔

"ہائے بے چاری لورا؟" بی آپا نے ایکدفعہ پھر آہ بھری۔

"ہاں تو پھر؟" میں نے بے صبری کے ساتھ کہا۔

"پھر کیا۔ اس واقعہ کے فورا" بعد نیویارک کے ایک بانجھ اور امیر یہودی جوڑے نے اخبار میں اشتہار دیکھ کر اسے گود لے لیا۔ اور اس کا نام مونا رکھ دیا یہ خاندان رئیل اسٹیٹ کا کاروبار کرتا تھا اور ان کے پاس اپارٹمنٹ والی عمارتوں اور پلاٹوں کی صورت میں کروڑوں کا اثاثہ تھا۔ مونا کی پرورش ظاہر ہے بہت ہی ناز و نعم کے ساتھ ہوئی اچھی تعلیم و تربیت اور اچھی زندگی۔ مونا کو اس گھر میں سب کچھ ملا۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مونا جیسے جیسے جوان ہوئی اسے احساس ہونے لگا کہ اس کے موجودہ والدین اس کے اصل والدین نہیں ہیں۔ شاید اس کے احساس کو اس بات سے بھی تقویت ملی کہ اس کے والدین انتہائی گورے تھے جبکہ مونا اچھی خاصی سانولی تھی۔

"ارے ہاں، چند سال قبل جب میں یہاں آئی تھی تو اسے پہلی بار دیکھا تھا وہ بالکل پاکستانی لگتی تھی۔ اب تو میک اپ و یکپ کرکے اچھی خاصی بدل گئی ہے۔" بی آپا نے لقمہ دیا۔

”اس کے چند سال بعد مونا کے نئے والدین کی طلاق ہوگئی اور مونا اپنی ماں کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ مگر مونا کے باپ نے اس کے لئے لاکھوں ڈالر کی جائیداد چھوڑی، جس سے اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی رخنہ نہیں پڑا۔ وہ بہت سنجیدہ طالبہ تھی اور یونیورسٹی پہنچی اور بالآخر قانون کی ڈگری حاصل کرلی۔“ شیبا نے توقف کے ساتھ کہا۔

”واہ اسے کہتے ہیں قدرت کا کمال یعنی اس کا نانا بھی وکیل تھا اور اب وہ خود بھی وکیل بن گئی۔“ بی آپا نے حیران ہوکر کہا۔

”اب مونا کوئی بائیس برس کی ہوچکی تھی۔ ایک دن مونا کے بے حد اصرار پر اس کی ماں نے اسے اصل حقیقت سے آگاہ کردیا۔ اب کیا تھا، پل بھر میں مونا کے تمام کاکھ محل دھڑام سے زمین پر آرہے۔ ایک طویل عرصہ تک چپ سادھے کھوئی کھوئی سی پھرتی رہی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی، کچھ کرنا چاہتی تھی مگر اسے پتہ نہیں تھا کہ کیا۔ کچھ ڈھونڈنا چاہتی تھی پر پتہ نہیں تھا کہ کیا، کہاں اور کیسے ڈھونڈے؟“

”تو کیا تم اس زمانہ میں ایک دوسرے سے واقف تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بس انہی دونوں ہم ایک دوسرے کے دوست بنے، وہ اکثر صلاح مشورے مجھ سے ہی کرتی اور میں نے بھی اسے یہی رائے دی کہ کسی طرح اس کے اصل ماں باپ کا پتہ لگانا چاہیے۔

”پھر اگلے تین سال تک مونا نے اپنے والدین کی تلاش میں دن رات ایک کردیئے۔ جب اس نے بچے گود لینے والی فلاحی تنظیموں سے رجوع کیا تو بیشتر نے یہ کہہ کر مدد کرنے سے انکار کردیا کہ بچوں کے مستقبل کے پیش نظر، صیغہ راز ان کا خاص اصول ہے۔ پھر بھی مونا اشاروں، کنایوں سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ اس کا نانا کس کالج سے فارغ التحصیل تھا اور یہ کہ وہ وکیل تھا۔ اس کی ماں کا نام سارہ تھا اور اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد نیویارک چھوڑ کر غالباً کیلیفورنیا چلے گئے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مونا نے اب مکمل سراغ رساں کا روپ دھار لیا؛ بلکہ ایک آدھ سراغ رساں کی خدمات بھی حاصل کرلیں۔ وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نانا کا سراغ لگانے کے لئے پچاس برس پرانے ریکارڈ و رجسٹروں کی چھان پھٹک میں مصروف رہی۔ پھر اس نے نانا

کے وکالت کے پیشہ کے مدنظر اس کی پیشہ وارانہ نقل و حرکت کا سراغ لگایا۔ ہوتے ہوتے بالآخر کیلیفورنیا پہنچ کر کڑی گم ہوگئی"۔ شیبا سانس لینے کے لئے رکی۔

"چلو' یہ سسپنس اب ختم بھی کرو' آخر اسے پتہ کیسے چلا؟" بی آپا نے ایک بار پھر بے صبری کا مظاہرہ کیا تو میں نے کہا "بی آپا اسے اپنے ڈھنگ سے بولنے دو نہیں تو لاس اینجلس اتنا بڑا شہر ہے کہ کڑی بالکل غائب ہوجائے گی۔ ہاں شیبا تو پھر کیا ہوا؟"

"پھر مونا' کو پتہ چلا کہ لوس اینجلس میں ایک مشہور خاتون ڈاکٹر رہتی ہے جو خود بھی اسی طرح گود لی گئی تھی مگر آج تک اس کے والدین کا پتہ نہیں چل سکا۔ اب بقیہ زندگی اس نے اسی طرح کے بچوں کے گمشدہ والدین کو تلاش کرنے کے لئے وقف کررکھی ہے اور اب تک کوئی پانچ سو بچوں کو ان کے اصل والدین سے ملوا چکی ہے۔ مونا نے بھی اس ڈاکٹر کی مدد حاصل کی۔ اور پھر کمال یہ ہوا کہ آج سے کوئی آٹھ ماہ قبل اس نے مونا کی ماں سارہ کا سراغ لگا لیا جو اب شادی شدہ عورت تھی اس کا خاوند سائیکاٹیری کا ڈاکٹر تھا اور اس کی ماں اب دوسرے بچوں کے ساتھ فلاں شہر میں رہتی تھی۔ اس نے مونا کو اس کا پتہ بھی دیا اور ٹیلی فون نمبر بھی مگر ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ پہلا رابطہ اگر خط کے ذریعہ کیا جائے تو موزوں رہے گا' ٹیلیفون پر بات کی ابتداء کرنے سے پیچیدگیاں حائل ہوسکتی ہیں۔ ماضی کا تجربہ یہی بتلاتا ہے۔ ڈاکٹر نے رائے دی۔

مونا ایک دفعہ پھر زندگی کی پراسرار بھول بھلیوں میں گم ہوگئی۔ [illegible] کیا کرے۔ خط لکھے تو کیا لکھے۔ ٹیلیفون کرے تو اسے کن الفاظ کے ساتھ مخاطب کرے؟ سارہ اب اس کی ماں بھی نہیں ہے دوست بھی نہیں' بلکہ واقف کار بھی نہیں۔ اس کی راتوں کی نیند ایک بار پھر حرام ہوگئی۔ وہ اسے تصور ہی تصور میں خط لکھتی اور پھر انہیں پھاڑ دیتی۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے ٹیلیفون کرے گی اور اس نے اس کام کے لئے کاغذ پر لکھ کر ایک مختصر سا اسکرپٹ تیار کیا۔ ٹیلیفون کے پاس گئی۔ اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جب اس نے ٹیلیفون کو چھوا تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے فون واپس کھانچے میں رکھ دیا۔ [illegible] کچھ دیر بے چینی اور شدید تناؤ کی کیفیت کو کم کرنے کی غرض سے ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ جب

ذہنی دباؤ کچھ کم ہوا تو [illegible] پھر ٹیلیفون کے قریب آئی۔ جی کو لاکھ کڑا کر کے بالاخر ڈائیل پر نمبر گھما ڈالے۔ دوسری طرف گھنٹی کی آواز سن کر اس کا ذہن ایک بار پھر ماؤف ہونے لگا۔ وہ ابھی سکتے کے سے عالم میں تھی کہ دوسری طرف سے کسی نے ٹیلیفون اٹھایا۔ وہ سہم گئی۔

"کون؟ ایک مردانہ آواز نے پوچھا۔"

"کیا میں سارہ سے بات کرسکتی ہوں؟" مونا نے یہ الفاظ جلدی سے اگل دیئے۔

"نہیں" یہ سن کر اس کے ذہن پر بجلی سی گری۔ اتنے میں آواز پھر آئی۔ "سارہ شاپنگ کرنے کے لئے باہر گئی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر میں آجائے گی۔ کیا میں آپ کا پیغام لے سکتا ہوں؟" مردانہ آواز نے پوچھا۔

"نہیں، میں پھر ٹیلیفون کرلوں گی"۔ مونا نے ٹیلیفون فوراً" بند کردیا۔

"اچھا! تو تم ہو۔" مونا نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے سر کو ہلکا سا پیچھے کی طرف ڈھلکاتے ہوئے چین کا گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ [illegible] اس کامیابی پر روئے یا ہنسے، مگر اس کی ہمت اب بڑھنے لگی۔ [illegible] اب منزل کے بہت قریب پہنچ گئی تھی۔ ایک طویل اور جان توڑ تلاش اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی۔

شام ہوئی تو وہ اسکرپٹ اٹھائے ٹیلیفون کے پاس گئی اپنے آپ کو سنبھالا دیا۔ بال ٹھیک کئے۔ شیشے میں ایک نظر اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ دانتوں کو بھینچے ہوئے ہونٹوں تلے دبا کر دل کو مضبوط کیا۔ اور پھر تھیٹر کے ایک نووارد فنکارہ کی طرح میکانکی انداز میں اپنے ڈائیلاگ ادا کرنے کے لئے اسٹیج پر آئی اور پھر نیم غنودگی کے سے عالم میں ایک ایک کرکے نمبر گھمادیئے۔

"یس! سارہ۔" دوسری طرف سے ملائمت بھری آواز نے کہا۔

"میں نیویارک سے بول رہی ہوں۔ میں ۱۹۵۹ء کی فلاں رات، فلاں تاریخ فلاں ہسپتال میں اتنے بجے پیدا ہوئی تھی میرا نام لورا بارینٹ اور میری ماں کا نام سارہ تھا۔ مگر میں نے اپنی ماں کو کبھی نہیں دیکھا۔" مونا نے منجھی ہوئی اداکارہ کی طرح یہ الفاظ متانت کے ساتھ ادا کردیئے۔

"تو پھر؟" .... دوسری طرف کچھ دیر خاموشی کے بعد جذبات سے عاری ایک

نسوانی آواز آئی۔

"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں؟" مونا نے بھی جذبات سے عاری آواز میں جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔" مونا اسکرپٹ پڑھتی گئی۔

"کیا؟" دوسری طرف کی آواز نے پوچھا۔

"بات لمبی ہے ٹیلیفون پر نہیں ہوسکتی۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"طویل خاموشی۔ پھر دوسری آواز۔ "میں اب شادی شدہ عورت ہوں، میرا ایک خاوند ہے۔ بچے ہیں۔ میری ایک زندگی ہے۔ دوسری آواز خاموش ہوگئی۔

"میں تمہاری زندگی پر اثرانداز ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ میں بس چند لمحوں کے لئے تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہیں مجھ سے مل کر افسوس نہیں ہوگا، بس تھوڑا سا وقت۔ دن اور وقت بتلاؤ، میں بذریعہ جہاز آؤں گی اور تم سے مل کر واپس لوٹ آؤں گی۔" مونا نے اسکرپٹ کے ڈائیلاگ ختم کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا جواب تو میں تمہیں اپنے خاوند سے پوچھ کر ہی دے سکتی ہوں۔" سارہ نے کہا۔

"اچھا، تو خاوند سے اجازت لے لو۔ میں کل اسی وقت تمہیں دوبارہ ٹیلیفون کروں گی۔" مونا نے فون بند کردیا۔

دوسرے دن جب مونا نے فون کیا تو سارہ نے فون اٹھایا اور کہا۔

"تم یہاں آسکتی ہو مگر ملاقات کے دوران میرا خاوند بھی موجود ہوگا۔"

"نہیں پہلے ایک گھنٹہ تک میں تم سے تنہا ملنا چاہتی ہوں پھر تمہارا خاوند آئے اور ملے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" مونا نے شرط لگاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو آجانا۔"

"کہاں، گھر؟" مونا نے بے صبری سے پوچھا۔

"نہیں، پہلی ملاقات فلاں ہوٹل میں صبح رہے گی۔"

"کس وقت؟ مونا نے پراشتیاق آواز میں پوچھا۔

"جب تم آسکو۔"

"اچھا! تو پھر شام کے چار بجے ٹھیک رہے گا۔ میرا جہاز سہ پہر کے ڈھائی بجے وہاں پہنچے گا۔" مونا نے ٹیلی فون بند کردیا۔

دوسرے دن مونا گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ ایک ہاتھ میں تھامے کیلیفورنیا کے لئے ہوائی جہاز میں سوار ہوئی۔ معینہ وقت پر ہوٹل پہنچی۔ حسن اتفاق سے دونوں عورتیں ایک ساتھ دروازے کے سامنے پہنچیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہچان گئیں مگر ان کے منہ سے کچھ نہ نکلا' بس چپ چاپ کھڑی ایک دوسرے کو تکتی رہیں۔ دربان نے یہ کہہ کر ان کا سکوت توڑا۔

"ارے کتنی پیاری ماں بیٹی ہیں۔ غالباً دیر سے ملی ہیں۔ ارے بیٹی پھول ماں کے ہاتھ میں تھمادو اور اندر آجاؤ۔" مونا نے گلدستہ سارہ کی طرف بڑھایا اور اسے ہوٹل کے دروازے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ دونوں عورتیں ریستوران کے ایک کونے میں میز پر جابیٹھیں۔ ابھی تک دونوں میں سے کسی نے بھی منہ نہ کھولا تھا۔ سارہ کبھی مونا کے بالوں کو گھورتی' اس کی آنکھوں میں جھانکتی اور کبھی اس کے ہاتھ پیروں کو تکنے لگتی۔ مونا بھی اسی طرح دیر تک گھور گھور کر سارہ کا جائزہ لیتی رہی۔ ابھی تک دونوں کو یہ احساس نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے سے مل کر روئیں یا خوشی کا اظہار کریں۔ مونا اب کسی طرح اس منجمند لمحے کو پگھلانے کی فکر میں تھی کہ سارہ یکلخت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی دیر تک مونا کو گھور گھور کر دیکھتی اور روتی رہی مونا کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملاتے رہے۔ غرضیکہ پورا گھنٹہ اسی کیفیت میں گذر گیا اور وہ ایک دوسرے کو مخاطب نہ کرپائیں۔ اتنے میں سارہ کا خاوند بھی آن پہنچا اور سائیکاٹری کا ڈاکٹر ہونے کے حوالے سے معاملہ کی پیچیدگی کو فوراً بھانپ گیا اور اس نے دونوں کے درمیان میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا' مونا؟ بڑا پیارا نام ہے۔ میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تم نے سارہ کو تلاش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔"

مونا اب پوری طرح ہوش و حواس میں آچکی تھی اور اب اس نے اسکرپٹ کے باقی ڈائیلاگ بھی ادا کرنے شروع کردئے۔

"جب مجھے پتہ چلا کہ میرے اصل والدین کوئی اور تھے تو میری زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا۔ اس احساس سے کہ مجھے پیدا ہوتے ہی ٹھکرا دیا گیا تھا یا چھوڑ دیا گیا تھا میرے ذہن میں ایک عجیب کامپلیکس پیدا ہوگیا اور خاص کر جب میرے والد نے میری گود کی ماں کو بھی چھوڑ دیا تو ایک دفعہ پھر چھوڑے جانے یا ٹھکرائے جانے کے احساس نے میرے اعصاب کو مزید جکڑ کر رکھ دیا۔ میں اب کسی کے ساتھ بھی سنجیدگی کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھانے سے خوف کھانے لگی کہ وہ مجھے چھوڑ دیں گے۔ میں لڑکوں کے ساتھ دوستی کرنے سے بھی کترانے لگی کہ وہ مجھے جلد چھوڑ دیں گے۔ میں بہت پریشان رہنے لگی اور اکثر اپنے بارے میں سوچتی کہ میں کون ہوں۔ میری ماں کون تھی اور یہ کہ میرا اصل باپ کون تھا۔ وہ لوگ کیسے ہوں گے۔ مختصراً" یہ کہ اپنے اصل والدین سے اپنائے جانے کی خواہش میرے ذہن پر بھوت کی طرح سوار ہوگئی۔ میں آخر کوئی گود لی ہوئی بلی یا کتا تو نہیں تھی۔ میں انسان تھی اور مجھ میں ایک بچے کی سی تڑپ کے ساتھ' اپنے ماں باپ کو ڈھونڈ نکالنے کی فطری خواہش پیدا ہوئی۔ بس ایک موہوم سی خواہش کہ میں ان سے ملوں ان کا پیار دیکھوں۔ ان سے دل کی باتیں کروں۔ ماں کے کندھے کے ساتھ سر جوڑ کر روؤں اور دل کا بوجھ ہلکا کروں۔ مونا ابھی بول ہی رہی تھی کہ سارہ نے لپک کر مونا کو اپنے سینے کے ساتھ لگالیا۔ اور پھر اس کی گردن میں منہ چھپا کر دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اتنے میں ڈاکٹر چپکے سے اٹھ کر باہر چلا گیا تاکہ ماں بیٹی کے درمیان فطری رشتہ قائم ہونے میں آسانی ہو۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر واپس آیا اور کہنے لگا۔

"مونا تم غلط مت سمجھنا۔ مگر ہم نے ابتداء میں کچھ سوال اس لئے کئے تھے کہ بہت سے افراد اپنے والدین کو اس لئے ڈھونڈتے ہیں کہ ان پر مقدمہ دائر کریں۔ ان کی جائیداد سے اپنا حصہ مانگیں اور یا انتقام لیں۔ مگر تمہاری باتوں سے پتہ چلا کہ تم کو محض قرب و پیار کی تلاش تھی بامتا کا انوکھا پیار اور اب تمہیں وہ منہ مانگا ملے گا۔" لمحہ بھر کے لئے خاموش رہ کر وہ پھر بولنے لگا۔

"مونا یقین کرنا' برسوں پہلے جب میں نے تمہاری ماں سارہ سے شادی کی تو وہ ہوبہو تمہاری جیسی لگتی تھی۔ وہی بال' وہی آنکھیں وہی ہاتھ پیر اور وہی سر کا جھٹکنا۔

مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے جون بدل کر پھر سے جوان ہو گئی ہو۔" ڈاکٹر اب پورے طور پر اپنی سائیکاٹری کی قابلیت بگھار رہا تھا۔

ماں بیٹی ایک بار پھر ایک دوسرے سے لپٹ کر دیر تک روتی رہیں اور جب بھڑاس کچھ ہلکی پڑی تو ڈاکٹر نے کہا۔

"مونا' معاف کرنا آج ہم تم کو گھر نہیں لے جاسکتے۔ کیونکہ بچوں کو تمہارے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے اور یہ کہ ہماری بڑی لڑکی کی عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ مگر جب تم دوبارہ آؤ گی تب تک سب ٹھیک ٹھاک ہوجائے گا۔"

مونا بھلا کیا جواب دیتی۔ چپ چاپ اٹھی انہیں الوداع کہا اور ائیرپورٹ کا رخ کیا۔ اب مونا دو ماؤں کے درمیان دو شہروں کے بیچ ایک میلے ایپرن کی طرح لٹک رہی ہے۔

(۱۴)

موت کا منظر

یہ غالباً ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کا ذکر ہے۔ لاہور میں شام کے چار بجے تھے اور میں ماڈل ٹاؤن سے شہر کی طرف جانے والی بس میں سوار ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے سامنے کھڑے ہوئے [illegible] نوجوان قریب میں بیٹھے ہوئے ایک مولوی نما حلیے کے شخص سے ہنس ہنس کر مذاق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور وہ مولوی نما شخص بھی جواب دینے کی بجائے جھینپ کے مارے بس کے فرش میں گڑا جا رہا تھا۔ میری قوت سماعت بے حد خراب ہو چکی ہے لہٰذا کچھ ٹوٹے پھوٹے جملے جو میرے کانوں میں پڑے وہ کچھ یوں تھے۔

"تمہارا چاچا تو جنت کا ٹکٹ کٹوا گیا' وہ بھی ہوائی جہاز کے ذریعہ۔ یعنی فرشتہ عزرائیل کو تو تکلیف ہی نہیں کرنی پڑی۔ اور ہاں دو بے چارے امریکی چاچوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ کوئی اللہ کو پیارا ہو تو ایسے ہو۔"

مجھے یہ جملے سن کر اور مولوی کو فرش بوس ہوتا دیکھ کر اس مذاق کی غیر معمولی نوعیت کا احساس تو ہوا' مگر میری ہمت نہیں پڑی کہ ان سے پوچھوں کہ ماجرہ کیا ہے۔ اتنے میں میرا مطلوبہ بس اسٹاپ آگیا اور میں بس سے اتر کر اپنی منزل کی طرف جانے والی ایک ویگن میں سوار ہوا۔ اتنے میں چند نوجوان لڑکے دوڑتے ہوئے آئے۔ کچھ مسافروں سے کھچا کھچ بھری ویگن کے اندر ڈھیر ہو گئے اور ایک آدھ ویگن کے دروازے کے ساتھ لٹک گئے۔ یہ لڑکے بھی بار بار قہقہہ لگا کر کسی اندرونی غیر معمولی مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ہو نہ ہو آج کوئی بڑی بات ہوئی ہے' میں نے دل ہی دل

میں خیال کیا۔ مگر اب بھی کچھ پوچھنے کی ہمت اس لئے بھی نہیں ہوئی کہ ان دنوں پاکستان کے جو حالات تھے ان کے مدنظر کوئی اچھی خبر سننے کی امید کم ہی تھی۔ ایک بار پھر ٹوٹے پھوٹے جملے میرے کانوں میں پڑے۔

"چلو، جان چھٹی۔ جرنل ضیاء نے ملک کو ایسی جگہ لاکھڑا کیا تھا کہ اب [redacted] خود نہ اڑتا تو پورا ملک ہی اڑجاتا۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"تو کیا یہ سچ ہے کہ ضیاء صاحب" ------ ایک قریب میں بیٹھے ہوئے بزرگ مسافر نے پوچھنے کی کوشش کی۔

"ہاں! ہاں! آج بہاولپور میں ضیاء کے طیارے کو اڑا دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ درجنوں دوسرے جرنل اور امریکی سفیر وغیرہ بھی مارے گئے۔" ان میں سے ایک نوجوان نے چسکا لے کر اعلان کیا۔"

"یہ تو آخر ہونا ہی تھا------" ایک اور مسافر نے چین کا سانس لیتے ہوئے کہا اور تب میں سمجھا کہ اصل واقعہ کی نوعیت کیا ہے۔

میرا ذہن ایک دم ایک دہائی پیچھے کی طرف لوٹ گیا۔ سندھ کے دیہات میں اسی طرح ایک شام بس میں بیٹھے، سفر کے دوران میں نے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کی خبر سنی تھی۔ اور ان دونوں ہی غیر معمولی اموات کے دوران جو بات مشترک تھی وہ یہ کہ بس میں بیٹھ کر بھٹو کی خبر سندھ کے دیہات میں سنی تھی جو اس کا گڑھ تھا اور ضیاء کی خبر لاہور میں سنی جہاں اس کا طوطی بولتا تھا اور ان دونوں ہی جگھوں میں ردعمل کے طور پر لوگوں کا تاثر ملا جلا تھا۔ دونوں ہی کی شخصیت و سیاست تضادات کا ملغوبہ تھی۔ ان کی حمایت یا مخالفت محض گروہی نوعیت کی تھی۔ پہلی موت پر ایک گروہ خوش تھا تو دوسرے کی موت پر اس کا مخالف دھڑا۔ مگر دونوں ہی صورتوں میں عوام الناس نے جن کا تعلق نہ اس دھڑے سے تھا اور نہ اس دھڑے سے بنا منہ کھولے چین کا ایک گہرا سانس لیا۔

شام کے کوئی چھ بجے کے قریب میں اپنے میزبان دوست کے گھر پہنچا تو یہ خبر آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل چکی تھی لوگ ملے جلے احساسات کے ساتھ ساتھ خیالی گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ کوئی کہتا کہ اس میں افغان حکومت کا ہاتھ ہے تو کسی نے

شیعہ فرقے پر شک ظاہر کیا۔ کیونکہ چند دن قبل ایک شیعہ عالم عارف الحسینی کا پشاور کے قریب قتل ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے ضیاء حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ کچھ کہتے کہ اس مین ہندوستان کا ہاتھ ہے کیونکہ ضیاء حکومت مشرقی پنجاب میں سکھ بغاوت کی حمایت کررہی تھی اور کچھ کہتے کہ اگر اس حادثہ میں امریکہ کا ہاتھ ہوتا تو ان کا اپنا سفیر اور ایک امریکی جرنل کیوں مارے جاتے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی ہی باتیں تھیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میزبان دوست نے پوچھا۔

”میرا تو خیال ہے کہ اسے امریکی شے پر مارا گیا ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”وہ اس لئے“ میں نے اپنی قیاس آرائی کو وزن دار بناتے ہوئے کہا۔ ”کہ پاکستان میں اب حالات ایسی جگہ پر آن پہنچے تھے کہ اس علاقہ میں امریکی مفادات کو سخت خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ امریکی مفادات کی خیر اسی میں تھی کہ کسی طرح فوجی گھوڑے کو بیرکوں میں واپس لاکر حکومت کی باگ ڈور جمہوریت کے نام پر پیپلزپارٹی کے جاگیرداروں کو سونپی جائے۔ لہٰذا موجودہ حالات کو جوں کا توں رکھنے یا بالفاظ دیگر اسٹیٹس کو Status quo کو قائم رکھنے کا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ اور ضیاء کو راستہ سے ہٹائے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا تھا۔ کیونکہ امریکی مفادات کے مدنظر جرنل ضیاء مذہبی بنیاد پرستی کے اعتبار سے امریکی توقعات سے بھی کہیں آگے نکل گیا تھا۔ تو گویا امریکی لابی نے ایسا کرکے آنے والی چند دہائیوں کے لئے علاقہ میں اپنے مفادات کو محفوظ کرلیا۔“ میں نے اختصار کے ساتھ کہا۔

”مگر ان حالات مین امریکیوں کو اپنا سفیر اور ایک جرنل مروانے کی کیا تک تھی۔؟“ دوست نے پوچھا۔

”سازش کرنا غالباً“ اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا سازشی حقائق کو چھپائے یا دبائے رہنے کا ہوتا ہے۔ امریکی سی۔ آئی۔اے اس سے پہلے بھی عظیم تر امریکی مفادات کی خاطر ویٹ نام میں ایسا کرچکی ہے۔ اس سے کم سے کم بے یقینی کی سی فضا قائم ہوجاتی ہے۔ یعنی سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“ میں نے اپنی منطق کو زوردار بنانے کے لئے کہا۔ ”مگر چونکہ عمومی طور پر یار لوگ واقعات کی ظاہری اور سطحی شکل کے

حوالے سے حالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے میری منطق کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔

اس واقعہ کے ٹھیک دس ماہ بعد اب میں نیویارک میں تھا۔ آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ مین ہٹن کی بڑی بڑی سڑکوں پر بیشتر فٹ پاتھ کے اخبار فروش پاکستانی تھے۔ بالکل پاکستان کی طرح سڑک کے دائیں بائیں، کونے کھدروں میں جہاں جگہ ملتی اسٹال لگا کر رسالے اور جریدے بیچتے۔ ایک دن براڈوے Broadway پر سیر سپاٹے کے دوران میں نے اسی قسم کے اخبار فروش کے پاس سے گزرتے ہوئے وینٹی فیئر' Vanity-Fair نام کے ایک رسالے پر میری نظر پڑی۔ یہ جون ۱۹۸۹ء کا شمارہ تھا جس کے ٹائٹل کور پر جرنل ضیاء کی بڑی سی رنگین تصویر چھپی تھی اور اندر کے صفحات میں جرنل ضیاء کی موت کے بارے میں ایک بڑا تفصیلی مضمون چھپا تھا جو ایڈورڈ جے' ایپسٹائن نے لکھا تھا۔ میں نے فوراً" اس مضمون کی نقل بنا کر لاہور والے اپنے دوست کو بھیج دی۔ اس مضمون کی تفصیل میں جانا تو میرے لئے یہاں ممکن نہیں مگر لب لباب کے طور پر ایپسائن کی تحقیق کا نچوڑ یہی تھا کہ جرنل ضیاء کے طیارہ کے حادثہ میں بلاشبہ پاکستان کی امریکی لابی ملوث تھی۔

اس تحقیقی مقالے میں چند ایک اہم پہلوؤں پر یوں بحث کی گئی تھی کہ جہاز کے گرنے سے پہلے غالباً" اس میں زہریلی گیس چھوڑی گئی تھی اور اس میں سوار تمام لوگ جہاز کے گرنے سے پہلے ہی ہلاک یا بے ہوش ہو چکے تھے۔ اور اس قسم کے گیس بم محض ترقی یافتہ ممالک کی دسترس میں ہیں۔ لاشوں کے پوسٹ مارٹم کرنے سے اس کی تحقیق بہت آسانی سے ہو سکتی تھی مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ نہ صرف یہ' بلکہ امریکی سفیر اور جرنل کی موت کے سلسلہ میں جو FBI ایف بی آئی کی ٹیم پاکستان میں آئی تھی اس کو بھی امریکی حکومت کے حکم پر فوراً" واپس بلالیا گیا تھا۔ اور یہ کہ امریکی تفتیشی ٹیم کے لئے یہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ آیا گیس بم استعمال ہوا' اور اگر ہوا تو کہاں سے کس راستہ سے پاکستان پہنچا۔

اس کے علاوہ جہاز کے حادثہ کے سلسلہ میں جتنے بھی ممکنات ہو سکتے تھے ان پر بڑی تفصیل سے سائنسی بحث کی گئی تھی۔ مصنف نے بیشتر تفصیلات امریکی پینٹاگون

Pentagon کی تین سو پینسٹھ صفحوں پر مشتمل خفیہ رپورٹ سے حاصل کی تھیں۔ اس رپورٹ میں شرلاک ہوم کی طرز پر تفتیش کرتے ہوئے بحث کی گئی تھی۔

۱۔ اگر جہاز کو ہوا ہی میں تباہ کردیا جاتا تو اس کے ٹکڑے بہت لمبے چوڑے علاقہ میں پھیلے ہوئے ہوتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا' بلکہ جب جہاز کے بہت سے ٹکڑوں کا مائیکرو الیکٹرون سکینر کے ذریعہ ملا کر اور جوڑ کر دیکھا گیا تو پتہ چلا کہ جہاز زمین پر گرنے سے پہلے صحیح سلامت تھا۔

۲۔ جہاز میزائل کا نشانہ بھی نہیں بنا۔ کیونکہ میزائل لگنے کے بعد اتنی شدید آگ اور گرمی پیدا ہوتی ہے کہ جہاز کے المونیم دھات سے بنے پینل پگھل جاتے ہیں اور جب جہاز غوطہ کھاتا ہے تو پگھلتا ہوا دھات گرتے وقت اپنے پیچھے لکیر سی چھوڑ جاتا ہے۔ مگر پینلوں پر اس قسم کی کوئی لکیر دیکھنے میں نہیں آئی اور نہ ہی جائے حادثہ پر میزائل استعمال کرنے کا کوئی نشان ملا۔

۳۔ اگر جہاز میں گرنے سے پہلے آگ لگتی تو مسافروں نے دھوئیں میں سانس لے کر جان دینی تھی۔ مگر امریکی جرنل کی واحد لاش جس کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تھا اس سے پتہ چلا کہ اس کے پھیپھڑوں میں دھوئیں بھرے سانس لینے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاز کے آگ لگنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

۴۔ اس شک کی صورت میں کہ جہاز کے انجن فیل ہوگئے ہوں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو جب جہاز زمین سے ٹکرایا تو اس کے پروپیلرز Propellers پوری قوت سے نہ چل رہے ہوتے۔ جو ان کے بلیڈوں کی خاص قوت سے خاص سمت میں ٹوٹنے یا مڑنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ باریک بینی سے دیکھنے پر پتہ یہ چلا کہ جہاز کے گرنے کے وقت اس کی پروپیلر بلیڈ پوری قوت سے چل رہی تھیں۔ یہ کہنا بھی غلط تھا کہ جہاز میں گندا تیل بھردیا گیا ہوگا یا تیل کے پمپ نے کام چھوڑ دیا ہوگا۔ کیونکہ بہاولپور میں تیل کی ٹنکی کو فوراً" قبضہ میں لے لیا گیا تھا اور تیل صحیح نکلا۔ دوسرے یہ کہ ملبے سے ٹوٹا ہوا تیل کا پمپ ملا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے آخری وقت تک کام کررہا تھا۔

۵۔ جہاز کا بجلی کا سسٹم بھی ناکارہ نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ جہاز میں جو بجلی کی گھڑیاں لگی تھیں ان کی سویاں عین وہیں کھڑی تھیں جس وقت جہاز زمین سے ٹکرا کر تباہ ہوا۔

۶۔ اس کے علاوہ حادثہ ایسے حالات میں ہوا، جبکہ تمام ہوائی اصولوں کی باقاعدگی سے پابندی کی گئی تھی۔ دن اور موسم صاف ستھرا تھا۔ دونوں پائیلٹ سی ۔ ۱۳۰ جہاز کے ماہر اور اچھی صحت و حالت میں تھے۔

۷۔ بس، پھر بات یہاں آکر رکی کہ ایسی حالت میں تو صرف کیمیکل فیلیئر ہی ہوسکتا تھا۔ یعنی کنٹرول اپنا کام چھوڑ جاتے، مگر سی-۱۳۰ ہرکولیس طیارے میں ایک قسم نہیں بلکہ تین قسم کے کنٹرول کا سسٹم ہوتا ہے۔ اس میں ایک سسٹم بھی کام کر رہا ہو تو پائیلٹ جہاز کو اڑائے رکھتا ہے۔ تفتیش نے یہ ثبوت فراہم کیا کہ حادثہ کے وقت کنٹرول صحیح طور پر کام کر رہے تھے۔

ان ساری تفتیشی ممکنات کے بعد ٹیم اس نتیجہ پر پہنچی کہ جہاز کو سبوتاژ کا نشانہ بنایا گیا تھا، جس سے وہ اپنا کنٹرول کھوگیا۔ اور اس قسم کے اڑا دینے والے ڈیٹونیٹر Detonator کے نشانات ملے ہیں جو کوکا کولا کے ڈبے کو اڑا دینے کے لئے کافی ہوں اور یہ کہ جس میں بغیربو کی زہریلی گیس بھری ہو، جس نے پائلٹوں کو فوری طور پر بے ہوش کردیا ہو۔

مگر اس سے آگے انکوائری کو چلنے ہی نہیں دیا گیا۔ جہاز کے عملہ کی لاشوں کا کوئی پوسٹ مارٹم نہیں کیا گیا، جس سے یہ ثابت ہوسکتا تھا کہ ان کی موت زہریلی گیس کے ذریعہ ہوئی تھی۔ بالآخر رپورٹ یہاں اس وجہ سے ختم ہوئی کہ چونکہ مجرمانہ سبوتاژ کا شبہ ہے لہٰذا یہ ٹیم مجرمانہ تفتیش کی مجاز نہیں ہے۔

مضمون کے مصنف ایپسٹائن نے بحث جاری رکھتے ہوئے دوسرے ذرائع سے بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاز کا عملہ ہوا ہی میں ناکارہ ہوا اور جس کی وجہ سے جہاز زمین پر آگرا۔ اور یہ کہ اگر اس سبوتاژ میں افغان، ہندوستانی، شیعہ یا الذولفقار کے لوگ ملوث ہوتے تو بھی وہ ایسا تو کرسکتے تھے مگر امریکہ اور پاکستان حکومتوں کی اونچی سطح پر انکوائری رکوانے یا گول مول کروانے کی تو وہ طاقت نہیں رکھتے

تھے۔ ایپسٹائن کے مطابق امریکہ میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے نہ صرف ایف بی آئی کی تفتیش کے راستے میں روڑے اٹکائے' بلکہ اس کے متعلق پریس میں بھی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ خواہ یہ پردہ پوشی کسی بھی نیک نیتی سے کی گئی ہو مگر پاکستانی جہاز کے اس حادثہ میں ایک موت سچائی کی بھی ہوئی تھی۔

(۱۴)

وحشی مغرب The Wild West

موجودہ امریکہ کے بچے کھچے ریڈ انڈین Red Indians لوگوں کی یاداشتوں اور لوک کتھاؤں میں مغرب اور اس کے بیشتر یورپی گورے نو آباد کار بے شک وحشی تھے۔ ان کی اکثریت جنہوں نے قبائلی امریکہ کی سرزمین پر دھاوا بولا' یورپی جیلوں سے چھوٹ کر آئی تھی اور یا پھر راتوں رات امیر بن جانے والے مہم جو لٹیرے اور ڈاکوؤں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے ابتدائی تین سو سال کی وحشت ناک جنگ و جدل کے دوران امریکہ کے مشرقی ساحلی علاقوں کے انڈین قبائل کا مکمل صفایا کردیا۔ اور جو بچ رہے وہ مغربی امریکہ کی طرف پسپا ہوکر اگلے دو سو سال تک بڑی بے جگری اور ڈھٹائی کے ساتھ اپنی سرزمین کے ساتھ چپکے رہے۔ امریکہ کا یہ مغرب دریائے مسی پی Mississippi اور میسوری Missouri کے پار کا علاقہ تھا جو بحراوقیانوس کے ساحلوں تک پھیلا ہوا تھا۔

یورپی نو آباد کاروں نے مشرقی امریکہ میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے دوران صلاح پسند انڈین لوگوں کے ساتھ امن کے کتنے ہی معاہدے کئے جن کی رو سے مغرب کا تمام علاقہ جو ابھی انڈین لوگوں کے ہاتھوں سے نکلا نہیں تھا ان کی مستقل میراث قرار پایا اور دریائے مسی پی و میسوری اس جبری تقسیم کی سرحد یا فرنٹیر قرار پائے۔ مگر ریڈ انڈین جو بنیادی طور پر انتہائی مہذب' امن پسند اور سیدھے سادھے لوگ تھے اور جو کسی قیمت پر بھی گورے نو آباد کاروں سے بے جا جنگ و جدل نہیں چاہتے تھے' وہ ابھی گورے لوگوں کی زمین کے لئے بھوک اور لالچ کا صحیح اندازہ نہیں لگا

پائے تھے۔

۱۸۳۸ء میں جب کیلیفورنیا میں سونے کی کان دریافت ہوئی (کیلیفورنیا ابھی میکسیکو کا حصہ تھا) تو مشرق کی طرف سے گورے نوآباد کاروں نے ایک مرتبہ پھر بقیہ ریڈ انڈین سرزمین پر دھاوا بول دیا جو اب مغرب کہلاتی تھی۔ نوآباد کاروں کی یہ نئی یلغار جن دو راستوں سے کی گئی اب [illegible] راستے کیلیفورنیا ٹریل Trail اور اوریگن ٹریل کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۸۴۰ء سے لے کر ۱۸۹۰ء تک ریڈ انڈین لوگوں نے جدید اسلحہ سے لیس گورے وحشیوں کا تیرکمان اور دشمن سے چھینے ہوئے ہتھیاروں کی مدد سے بڑی بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مگر وقت کا فیصلہ ان کے خلاف تھا۔

ایک دفعہ پھر آگ، خون اور خاک کی ہولی کھیلی گئی۔ چیف کریزی ہارس Chief Crazy Horse اور سٹنگ بل Sitting Bull جیسے جری اور بہادر سورما سرداروں نے اپنی دھرتی کا کمال ذہانت اور بہادری کے ساتھ دفاع کیا۔ مگر گورے لوگوں کے جدید اور مہلک ہتھیاروں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور وہ سب ایک ایک کرکے میدان کارزار میں کام آئے۔ اور جو بچ رہے وہ قیدی بنا لئے گئے ان کا مقدر اب بڑے بڑے قید خانے اور کانسنٹریشن کیمپ Concentraton Camps تھے جو اب انڈین ریزرویشن Indian Reservation کہلاتے ہیں۔ ایک نامور سردار سٹینڈنگ بیئر نے گورے نوآباد کاروں کے تصوراتی وحشی مغرب کی تشریح یوں کی ہے۔

”ہم نے اپنی سرزمین پر پھیلے ہوئے لامحدود اور زرخیز میدانوں، خوبصورت ڈھلتے پہاڑی سلسلوں اور سانپ کی طرح بل کھاتے دریاؤں اور شفاف چشموں کو کبھی بھی وحشت کے ساتھ تعبیر نہیں کیا۔ صرف گورے نوآبادکاروں کے لئے فطرت کے یہ حسین مناظر اور ان میں بسنے والے قدیم لوگ وحشت نما تھے۔ ہمارے لئے یہ دھرتی ماں کی گود کی طرح گداز، فرحت بخش، جلا آور اور روحانیت سے بھرپور تھی اور اس وقت تک رہی جب تک کہ مشرق کی طرف سے ریچھ کی طرح بالوں سے ڈھکی ہوئی ایک گنوار گوری قوم نے ٹڈی دلوں کی طرح یورپ سے آکر اپنی تمام تر وحشتوں اور ظلم و ستم کے ساتھ ہم پر ایک ناگہانی آفت کی طرح نازل نہ ہوئے اس پراسرار گوری قوم کی آمد پر جانور بھی اپنی پناہ گاہیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ یہاں تک کہ جنگل کے جیدار

درخت بھی ایک ایک کرکے گرنے لگے۔ تب تک ہمارے لئے مغرب کسی بھی صورت میں وحشی نہیں تھا۔"

گو کہ یہ میرا امریکہ کا تیسرا دورہ تھا مگر ہالی ووڈ Holly Wood کی کاؤ بوائے فلموں سے لئے گئے تاثر کے سوا مجھے مغرب کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا۔ اور نہ ہی یہ کہ ہالی ووڈ کی بیشتر کاؤ بوائے فلمیں ریڈ انڈین لوگوں کو وحشی دکھلا کر مغرب میں اپنے تاریخی جرائم پر پردہ ڈالنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ لہٰذا اس بار میں اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح یہ علاقہ دیکھوں۔ مگر امریکہ جس کی چوڑائی پانچ ہزار میل کو چھوتی ہے اور جہاں ہمارے حساب سے بے حد مہنگائی ہے' میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ایک رات حسن اتفاق کہ میرے ایک قریبی عزیز اور دوست غازی کا ٹیلی فون آیا۔ غازی اوری گون کی ریاست کے شہر پورٹ لینڈ میں رہتا تھا۔ اس نے یہیں انجنیئرنگ کی تعلیم حاصل کی شادی کی اور پھر یہیں بس رہا۔ غازی نے اصرار کیا کہ میں اوریگون ضرور 'آؤں' مگر جب میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا تو اس نے کہا کہ "تم اس کی فکر نہ کرو بس چلنے کی تیاری کرو۔"

پہلی جون کی ایک سہانی صبح میں سیٹیل Seattle کے لئے جہاز میں سوار ہونے کے لئے کینیڈی ایئرپورٹ پہنچا سیٹیل کا شہر ریاست واشنگٹن میں امریکہ کے شمال مغربی کنارے پر واقع ہے اور وہاں سے پورٹ لینڈ کے لئے ڈومیسٹک فلائٹ تھی۔ ٹھیک ۹ بجے جہاز مائل پرواز ہوا اور پھر کچھ دیر شمال مغرب کی طرف پرواز کرنے کے بعد پائلٹ نے اعلان کیا۔

"اب ہم کینیڈا کی سرحد کے قریب بیفلو کے شہر کو عبور کرکے نیاگرا فالز Niagra Falls پر مائل پرواز ہیں۔ میرے سامنے امریکہ کا ایک چھوٹا سا طبعی نقشہ رکھا تھا۔ نقشے کا جائزہ لینے کے بعد میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر زمینی نشانات کے ذریعہ ریاستی علاقوں کو شناخت کرنے کی کوشش کی۔ جھیل مشی گن اور جھیل سوپیریئر Lake Superior نظروں سے اوجھل ہوتی صاف نظر آرہی تھیں۔ ریاست مشی گن کے بڑے بڑے ہریالے زرعی فارم جو سیدھی اور آڑی لمبی لمبی لکیروں سے بنی مستطیل میں کٹے اور ہر سو پھیلے تھے اور ان کے کونوں میں زمینداروں کے بڑے بڑے

گھر اور مال گودام بنے تھے۔ جوں ہی جھیلیں نظروں سے غائب ہوئیں تو ریاست وسکو سن Wisconsin کے لہراتے ہوئے بڑے بڑے زمردی کھیت دیر تک آنکھوں کو خیرہ کرتے رہے۔ یہ علاقہ میں ۱۹۷۳ء میں دیکھ چکا تھا اور جہاں اپنے دوست کی معیت میں منومنی Minominee نام کی ایک چھوٹی سی انڈین ریزویشن کا دورہ بھی کیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد سانپ کی طرح بل کھاتا مسی سپی دریا نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی ریڈ انڈین قوم کا مغربی المیہ ہالی ووڈ کی فلم کی طرح ذہن میں گھومنے لگا۔ اب ہم مینی سوتا Minnesota کی ریاست کی حدود میں داخل ہوچکے تھے۔ امریکہ کی بیشتر ریاستوں، شہروں اور دریاؤں کے نام ریڈ انڈین قبائل کی یاد تازہ کرتے ہیں، جو محض ایک صدی قبل اس دھرتی پر ہزاروں سال سے آباد تھے۔ مگر اب محض نام باقی رہ گئے ہیں اور ان کے وجود کے بقیہ سب نشانات مٹائے جاچکے ہیں۔

مینی سوتا کی سرزمین چھوٹی چھوٹی جھیلوں سے اٹی پڑی تھی، جن کے کناروں کے ساتھ ساتھ زمانہ قدیم سے ہی مینی سوتا انڈین لوگوں کا بسیرا رہا تھا اور جہاں مچھلی کا شکار کرتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے پھرتے رہتے۔ انڈین لوگوں میں بھی دنیا کے دیگر قدیم لوگوں کی طرح زمین کی ذاتی ملکیت کا تصور نہیں تھا۔ زمین کی بہتات اور اجتماعی ملکیت کی وجہ سے لوگ مل جل کر کھیتی باڑی اور شکار کرتے اور مل بانٹ کر کھا پی لیتے۔ مگر گورے لوگوں کے نوآبادکارانہ نظام میں اب قدیم قبائل کے اشتراکی نظام کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔

کوئی آدھ گھنٹہ کی مزید پرواز کے بعد گدلے رنگ کا میسوری Missouri دریا نظر آیا۔ میں نے نقشہ پر پھر سے ایک نظر دوڑائی تو پتہ چلا کہ اب ہم ڈکوٹا Dakota اور سوں Sox نامی انڈین قبیلوں کی سرزمین پر مائل پرواز تھے۔ اب یہ علاقہ شمالی اور جنوبی ڈکوٹا کے نام سے دو ریاستوں میں بٹا ہوا ہے اس کے ساتھ ہی اوگلالہ سوں، Oglala Siox قبیلے اور اس کے بہت ہی نامور، جواں سال سورما سردار کے آخری معرکہ کا نقشہ میرے ذہن میں گھوم گیا۔ چیف کریزی ہارس Chief Crazy Horse نے چیف گال Chief Gall کی مدد سے زخمی گھٹنے کی لڑائی The Battle of Wounded Knee میں ۱۸۷۶ء میں جدید ہتھیاروں سے لیس ایک پورے امریکی

فوج کے ڈیوزن کا اس کے کمانڈر جنرل کسٹر General Custer سمیت مکمل طور پر صفایا کردیا تھا اور اس لڑائی میں ان کا ایک آدمی بھی زندہ نہیں بچا تھا۔

وسطی مغربی امریکہ کے زرخیز میدان اب ختم ہونے لگے تھے اور ان کی جگہ گھرے ہرے جنگلات نے لے لی تھی میرے نقشے کے مطابق غالباً" اب ہم مونٹانا Montana کی ریاست کی فضائی حدود میں تھے۔ اتنے میں ایک ایئرہوسٹس نے بڑے تپاک کے ساتھ پوچھا۔ "آپ کافی پئیں گے یا چائے؟" "کافی پلیز" میں نے اسی ملائمت سے جواب دیا۔

"پر پہلے یہ بتائیں کہ کیا ہم اس وقت ریاست مونٹانا کی حدود میں ہیں؟"

"اوہ! یہ بتلانا تو میرے لئے بے حد مشکل ہے" اس نے جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "ٹھہریئے' میں پائلٹ سے پوچھ کر ابھی بتلاتی ہوں۔" اور وہ سیٹوں کے درمیان ادھر ادھر ڈولتی کوکپٹ Cockpit کی طرف چلی گئی۔

چند لمحوں کے بعد پائلٹ کی آواز' مائیکروفون پر گونجی۔

"اب ہم کناڈا کی سرحد کے قریب مونٹانا کی ریاست پر مائل پرواز ہیں۔"

میرے دل میں ایک عجیب سی ہوک اٹھی اور میں پراشتیاق نظروں سے باہر جھانکنے لگا۔ جنگلات سے ڈھکے پہاڑی سلسلے۔ اب قریب آکر مزید صاف ہوگئے تھے۔ مونٹانا کا مسحور کن نام بچپن کی یادوں کے طور پر میرے لاشعور ذہن کے ساتھ ابھی تک چپکا ہوا تھا۔ یہ غالباً" پچاس کی دہائی کی شروعات کا ذکر ہے جب میں نے لڑکپن کے زمانہ میں ٹنڈو اللہ یار کے کیپٹل ٹاکیز میں ایک انگریزی فلم دیکھی تھی جس کا نام تھا مونٹانا کے جنگلات کی سرخ آگ۔ The Red Fires of Montana یہ فلم مونٹانا کے پہاڑی جنگلات میں بھڑکتی آگ اور اسے کمال ہوشیاری اور محنت سے بجھادینے سے متعلق تھی اور جنگلات چونکہ مجھے ہمیشہ سے پراسرار طور پر مسحور کردیتے ہیں' یہ واقعہ ذہن نشین رہا۔ اور اب ٹھیک پینتیس برس بعد میں عقاب کی طرح اڑتا ہوا اتنے قریب سے مونٹانا کے جنگلات کا جائزہ لے رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد پہاڑی سلسلہ برف پوش چوٹیوں میں تبدیل ہوتا گیا۔ میں نے پھر نقشہ ٹٹولا تو پتہ چلا کہ یہ شمالی امریکہ کے روکی پہاڑ Rocky Mountains تھے۔

برف سے ڈھکا یہ دل آویز پہاڑی سلسلہ دیر تک آنکھوں کو سرور بخشتا رہا' یہاں تک کہ ایک بار پھر کھلے میدان اور زرعی فارم نظر آنے لگے۔ اور اب ہم بلاشبہ ریاست واشنگٹن کی حدود میں پہنچ چکے تھے۔

"تھوڑی دیر کے بعد' ٹھیک پونے گیارہ بجے ہم سیٹل Seattle کے ایئرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔" پائلٹ کی ہوشیار کردینے والی آواز کانوں میں گونجی۔ میرے بازو میں بیٹھی ہوئی ایک گوری نوجوان حسینہ نے جو غالباً" نزلہ و زکام کی وجہ سے مسلسل کھانستی جارہی تھی' اپنی کمر کے گرد سیٹ بیلٹ کا پٹہ مضبوطی سے باندھنا شروع کردیا۔ اس کے ساتھ ہی جہاز کے انجن مدھم پڑتے گئے اور وہ نیچے کی طرف موڑ کاٹنے لگا۔ اب ہم زمردی رنگ بھرے کا سکیڈ رینج نامی پہاڑی سلسلہ کو عبور کر رہے تھے اور یہ پہاڑی سلسلہ جنوب میں ریاست اوریگن سے ہوتا ہوا کیلیفورنیا کے مشہور پہاڑ سیرا نوادا Sierra Nevada سے جاملتا تھا۔ سیٹل کی ایئرپورٹ پر جہاز تبدیل ہوا اور اس کے ایک گھنٹہ کے بعد ہم ریاست اوریگون میں پورٹ لینڈ کے ہوائی اڈے پر جا اترے جہاں غازی نے بڑے پر اشتیاق انداز میں مجھے خوش آمدید کہا۔

(۱۵)

اوریگون ٹریل (Oregon Trail)

پورٹ لینڈ کا شہر کاسکیڈ اور ساحلی پہاڑیوں کے درمیان ایک نہایت ہی سرسبز و شاداب وادی میں واقع تھا اس شہر کو گلاب کے پھولوں کا شہر یعنی The Rose City بھی کہتے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر اوریگون کے اس مغربی حصہ کو اس کے تمام تر ہریالے پہاڑی جنگلات زرخیز میدانوں کی وجہ سے وادی زمرد یعنی Emerald Valley کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

پورٹ لینڈ کو گلابی شہر کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ۱۹۱۷ء میں یہاں گلاب کے پھولوں کا ایک نہایت خوبصورت اور بڑا باغ لگایا گیا تھا، جو اب گلاب کے نت نئے رنگوں اور اقسام کے علاوہ اس کی افزائش نسل و تحقیق اور گلاب کے سالانہ قومی نمائش کے انعقاد و نیز اس سلسلہ میں طلائی تمغے حاصل کرنے کے لئے مشہور ہے۔

یہ بھانت بھانت کے پھول اب باغات سے نکل کر اپنے سفید، کالے، پیلے، اودے، قرمزی، نیلے اور سرخ عنابی رنگوں کے ساتھ پورے شہر میں پھیل گئے ہیں۔ ہر گھر اور ہر گلی کے نکڑ پر یا سڑکوں کے ساتھ ساتھ آپ کو گلاب ہی گلاب نظر آئیں گے۔ موسم بہار میں شہر کے سب سے بڑے میلہ کو بھی روز فیسٹیول یعنی Rose Festival کہتے ہیں۔ اتفاق سے جب میں پورٹ لینڈ پہنچا تو یہ میلہ اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ جاری تھا۔

مگر غازی نے جو میری دلچسپیوں کے علاوہ، پہاڑوں، وادیوں اور فطری نظاروں کی کمزوری سے بھی واقف تھا اگلے ہی دن کاسکیڈ رینج کے پہاڑوں میں کیمپ کرنے اور

کالے بوٹ نام کی ایک ۷۰۰۰ فٹ اونچی چوٹی پر چڑھنے کا پروگرام بنایا۔

۲ جون کی ایک سہانی دوپہر کو غازی اور میں کار میں سوار ماؤنٹ ہوڈ Mt. Hood کے لئے روانہ ہوئے۔ ماؤنٹ ہوڈ کے بیس Base میں کوئی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر برف سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان میں سکی سپورٹ Ski Sport کے مقابلے ہوتے تھے۔ جنگلات نے ڈھکی پہاڑیوں اور جھیلوں اور خوبصورت گھاٹیوں کے بیچ سے ہوکر جب ہم "سکی ریزورٹ" Ski Resort پہنچے تو مقابلے جاری تھے۔ سکی سپورٹ کے کھیل دیکھنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔

ہماری اگلی منزل گرم چشمہ کی ریڈ انڈین ریزرویشن Warm Spring Indian reservation تھی۔ مشرق کی طرف کوئی پچاس میل سفر طے کرنے کے بعد سڑک کے دائیں جانب گرم چشمہ انڈین ریزرویشن کا بورڈ نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی پہاڑی سلسلہ ڈھلوان کی صورت میں ڈھلتا چلا گیا اور درخت اور دیگر نباتات بھی اسی نسبت کے ساتھ پستہ قد اور دھرتی خشک اور بنجر ہوتی چلی گئی۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بحراوقیانوس کے ساحل کی طرف سے اٹھنے والے بارانی بادل کاسکیڈ کے پہاڑی سلسلہ کو عبور نہیں کرپاتے تھے اور اس کے پار کا مشرقی علاقہ خشک رہ جاتا تھا اور گورے نوآبادکاروں نے مغرب کے تمام تر ہریالے اور زرخیز علاقہ پر قبضہ جمانے کے بعد ریڈ انڈین لوگوں کو اس خشک علاقہ میں دھکیل کر محصور کردیا تھا۔ چوڑے چکلے میدان اور اس مین کٹی ہوئی گہری اور دل ہلادینے والی گھاٹیاں ہر سو پھیلی ہوئی تھیں۔ ان گھاٹیوں کے اونچے اونچے اور ترچھے کناروں کو ایک نظر دیکھنے سے ہالی ووڈ کی کاؤ بوائے Cow Boy فلموں کے مناظر ذہن میں آتے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ان پہاڑوں میں چھپے ہوئے سینکڑوں انڈین اپنے گھوڑوں پر سوار قطار میں کھڑے اب بھی متجسس اور عقابی نظروں سے ہمیں گھور رہے ہیں۔ اور پھر یہ تصور کرنا بھی مشکل نہیں تھا کہ ان کرخت گھاٹیوں کو انڈین لوگوں نے صدیوں اپنے خون سے سینچا تھا' جہاں کہیں کہیں اب بھی وہ اس دھرتی کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ مگر صرف ایک سو سال قبل اوریگون ریاست کا ہرا بھرا کل علاقہ ان کی جنم بھومی تھا۔ پر اب ان سادہ لوح بھولے بھالے قدیم لوگوں کا وقت ختم ہوچکا تھا۔ کیونکہ گورے لوگوں کی بڑھتی

ہوئی ٹیکنالوجی اور مہلک سے مہلک ہتھیاروں کی ایجادات کے سامنے وہ میدان ہار چکے تھے۔ انہوں نے ہر ایک معرکہ آرائی کے بعد صلح کرنی چاہی۔ زندہ رہنا چاہتے تھے مگر نو آباد کارانہ دور میں گورے آدمی کے پاس اس قسم کے انسانی جذبات و اخلاقیات کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا مغربی امریکہ میں سونے کی دریافت کے بعد تو چور، اچکے، قیدی اور بدمعاش غرض کہ وحشی اور بھوکے ننگے یورپی اس علاقہ پر بری طرح ٹوٹ پڑے تھے۔ یورپ کے نو آباد کاروں کی یہ نسل کش یلغاریں، کالونیل تاریخ کا بھیانک ترین المیہ کہی جاسکتی ہیں۔ بھوکے، خودغرض اور حریص لوگ راتوں رات امیر بن جانے کی خواہش میں بدمست مرد اور عورتیں جنہوں نے انڈین بال بچوں کا یوں صفایا کیا جیسے کہ انسان نہیں جانور تھے۔ بلکہ بعد میں انہیں لوگوں نے جانوروں کے تحفظ کے لئے بھی تنظیمیں قائم کیں۔ مگر انڈین لوگوں کی مکمل تباہی میں ان سب کے ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔ جس راستے سے ان انڈین لوگوں پر یلغار کی گئی اسے اوریگن ٹریل کہتے ہیں۔ جس کے ساتھ ساتھ انڈین لوگوں کی کھوپڑیوں اور جسمانی ہڈیوں کے انبار لگادیئے گئے تھے۔

اس تاریخی ٹریل کے بچے کھچے نشانات کے ساتھ اب نوٹس بورڈ لگے تھے جن پہ بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا۔ ”یہ وہ ٹریل ہے جہاں سے جرنل وِین فیلڈ اسکوٹ General Winfield Scott گزرا تھا۔“

گرم چشمہ ریزوریشن کوئی دو سو گھروں کی ایک چھوٹی سی انڈین بستی تھی، جہاں سانولے اور گندمی رنگ کے منگول نما چہروں والے سرخ انڈین لوگ رہتے تھے۔ بقول ریڈ انڈین کے ان لوگوں کو انڈین اس لئے کہا جاتا ہے کہ کرسٹوفر کولمبس نے یورپ سے اپنا تاریخی سفر شروع کیا تو ہندوستان کی تلاش میں نکلا تھا۔ مگر راستہ بھول جانے کے بعد اتفاقیہ طور پر جزائرِ غرب الہند میں سان سلواڈور کے جزیرے پر آن پہنچا اور وہاں کے باشندوں کو دیکھ کر سمجھا کہ ہندوستان پہنچ چکا ہے۔ اس لئے اس نے انہیں انڈین سمجھا جو ابھی تک انڈین کہلاتے ہیں۔

حسب معمول میں ان کی دستکاری کی دکان میں داخل ہوا۔ انڈین لوگوں کی دستکاری جو اکثر اوقات جانوروں کی کھال، پرندوں کے پروں اور چرمی نما منکوں

سے بنائی جاتی ہے' بہت ہی نفیس دل گداز اور خوبصورت ہوتی ہے۔ میں نے تحفہ کے طور پر کچھ خریدا جو اب بھی میرے کمرے کی دیواروں کی زینت ہیں۔

شام ڈھلے ہم گرم چشمہ سے نکل کر بینڈ نامی ایک چھوٹی سی گوری بستی میں پہونچے' جہاں غازی کا ہم زلف ایڈ Edd اور اس کی بیوی سارہ Sara رہتے تھے۔ ہپی تحریک کے عروج کے وقت یہ بستی ہپیوں کی ایک خاص آماجگاہ تھی۔ اگلی صبح چونکہ سارہ اور ایڈ نے بھی ہمارے ساتھ کالے بوٹ کی مہم پر جانا تھا اس لئے ہم نے رات ان کے ساتھ بسر کی۔ ایڈ وکیل تھا اور سارہ نرس۔ وہ یہودی نژاد اور بہت ہی بھلے لوگ تھے۔ رات کو انہوں نے ہمیں میکسیکن کھانا کھلایا جو ہمارے کھانوں سے بہت ہی ملتا جلتا ہوتا ہے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہم کالے بوٹ کی آتش فشاں نما پہاڑی چڑھنے کی غرض سے نکل پڑے۔ یہ پہاڑی چیڑ' دیودار' جینی فر اور فرانس کے دیو ہیکل مگر ہرے بھرے درختوں سے ڈھکی تھی۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر ہم نے کیمپ کی جگہ چنی جہاں ریاستی انتظامیہ نے بنیادی سہولتوں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ یہ علاقہ جنگلی جانوروں کی حفاظت کے لئے حفاظتی پارک بھی تھا جہاں جنگلی ہرن ادھر ادھر دوڑتے ہوئے دیکھے جاسکتے تھے۔

ہمارا کیمپ سائٹ مجموعی طور پر وادی کاغان کی یاد تازہ کر رہا تھا اور کنہار دریا کی طرح قریب سے ایک دریا گزرتا تھا جو پاس کی ایک پہاڑی سے چشمہ کی صورت میں نکلتا تھا جو دریائے میٹولس کہلاتا ہے۔ مگر وادی کاغان کے مقابلہ میں یہاں کے جنگلات بہت ہی ہرے بھرے اور قابل دید تھے۔ یہاں ایک خاص قسم کا چیڑ کا درخت اگتا تھا جو دیودار کی طرح طویل قامت تھا اور اس کے تنے جوگیا رنگ میں نہائے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کا نام پینڈورسا پائن تھا۔ اس کے علاوہ یہ جنگلات چوک چیری' چینکاپن' برفانی بیر وغیرہ کی جھاڑیوں کے لئے مشہور تھے۔ جب ہم چوٹی پر پہنچے تو دیکھا کہ ۱۹۸۱ء میں یہاں آگ لگ جانے کی وجہ سے اس کا پورا حصہ جل کر راکھ بن چکا تھا۔

شام کو دریائے میٹولیس کے کنارے سیر سپاٹے پر نکلے تو پتہ پڑا کہ قریب ہی ٹراؤٹ مچھلی کی افزائش و نسل کشی کے لئے وہاں ایک بہت بڑی ہیچری قائم تھی۔ اس

ہیچری میں سالانہ کوئی ڈھائی ملین مچھلیاں پیدا کی جاتی تھیں۔ پوری اوریگن ریاست میں اس قسم کی کل تیس ہیچریاں تھیں، جن میں پچھتر ملین مچھلیاں پیدا کی جاتی تھیں جو بڑی ہو کر بحراوقیانوس میں چلی جاتی تھیں۔ مچھلیوں کی اقسام میں رینبوٹراؤٹ، بروک ٹراؤٹ، ٹائیگر ٹراؤٹ، بلیو اور بھوری ٹراؤٹ و نیز ایٹلانٹک سالمن شامل تھیں۔ ریڈ انڈین لوگ ان مچھلیوں کو کوھو چیوک اور سٹیل ہیڈ کے نام سے پکارتے تھے۔

یہ مچھلیاں جب آٹھ ماہ کی ہوجاتیں تو دریائی ہیچری سے نکل کر قریب کے بحراوقیانوس میں چلی جاتیں۔ وہیں سمندر میں پل کر جوان ہوتیں اور پھر انڈے دینے کے لئے وقت آنے پر پھر اسی جگہ دریا میں لوٹ آتیں جہاں وہ پیدا ہوئی تھیں اور انڈے دے کر وہیں مر جاتیں۔ ریڈ انڈین لوگوں میں ٹراؤٹ مچھلی اور سالمن مچھلی کی اپنی جائے پیدائش پر لوٹ آنے اور بچے پیدا کر کے وہیں مرجانے کی بابت بہت سی لوک کتھائیں مشہور تھیں۔

دریائے سندھ کی پلا مچھلی بھی دریائی سالمن نسل سے تعلق رکھتی ہے جو دریائے سندھ میں انڈے دیتی اور پھر بحرہند کے سمندر میں پل کر جوان ہوتی ہے اور پھر سن بلوغت میں انڈے دینے کے لئے واپس دریا میں لوٹ آتی ہے اور پھر انڈے دے کر دریا میں مرجاتی ہے۔ سندھ کے مچھیروں میں بھی پلا مچھلی کے بارے میں اسی طرح کی پراسرار کتھائیں مقبول ہیں جیسا کہ ریڈ انڈین قبائل میں تھیں۔

(۱۶)

جپسی قبرستان

نیویارک میں جپسیوں سے پتہ چلا تھا کہ ریاست اوریگن میں ان کی خاصی بڑی تعداد رہتی ہے۔ جب میں پورٹ لینڈ پہنچا تو غازی سے اس سلسلہ میں استفسار کیا مگر وہ ان کے بارے میں بالکل کورا تھا۔ مگر اس کی بیوی الزبتھ نے بتلایا کہ اس نے سانولے رنگ کے کانوں میں سنہری بالیاں پہنے بچوں کے ساتھ گھومتے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو غالباً" جپسی تھے۔ مگر یہ بتلانا بہت مشکل تھا کہ کہاں سے آتے اور کہاں جاتے ہیں۔ اگلے دن غازی کے پوچھ گچھ کرنے پر پتہ چلا کہ قریب کے ایک قبرستان میں کچھ پراسرار قبریں ہیں جن پر مرنے والوں کی تصاویر بنی ہوئی ہیں یہ قبریں بڑی صاف ستھری رکھی ہوتی ہیں اور ان پر اکثر کھانے پینے کی چیزیں اور ہار مالائیں چڑھاوے کے طور پر رکھی ہوتی ہیں۔ غالباً" یہ قبریں جپسیوں کی ہیں۔" غازی نے مجھے بتلایا۔

دوسرے دن صبح سویرے میں سینڈوچ Sandwitches کا ڈبہ بغل میں دبائے قبرستان میں پہنچا جو کئی ایکڑ میں پھیلا ہوا تھا۔ عیسائی لوگوں کے گورے قبرستان بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ قیمتی پتھر سے بنی قبریں اس قرینے سے بنائی اور سجائی جاتی ہیں کہ انہیں دیکھ کر مجھ جیسے تیسری دنیا کے آدمی کا خوامخواہ مرجانے کو جی چاہتا ہے۔ میں دیر تک اس قبرستان میں گھومتا رہا اور پھر ایک کونے میں بہت ساری مخصوص قبریں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ان قبروں پر خوبصورت رنگین تصویریں بنی تھیں۔ یہ قبریں اکثر حالات میں جوڑوں کی صورت میں تھیں۔ اور خاوند بیوی کے جوڑوں میں اگر ایک فرد ابھی زندہ تھا تو اس کے لئے خالی جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ ان تصاویر کی سانولی اور

گندمی رنگت اور ہندوستانی ناک نقشہ سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ قبریں غالباً جپسیوں کی تھیں۔ ایک قبر پر بڑے حروف میں لکھا تھا۔ "جپسیوں کا بادشاہ" The King of Gypsies اس کا نام ایلیس تھا۔ مگر دیگر قبروں پر بڑے مخصوص نام تھے۔ مثلاً کاسٹیلو، میچل، جمالو، افراہیم، رسک، سارہ، روزی، لینا، زوھرا، دادو، دیوی، بسو، وغیرہ۔ تقریباً تمام جپسی قبروں کے سامنے کچھ پلاسٹک اور کچھ تازہ پھولوں کے گلدستے رکھے تھے، جس سے پتہ چلتا تھا کہ جپسی اپنے عزیز و اقارب کی روحوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔ عیسائیوں کی قبریں ان کے مقابلہ میں سونی سونی سی تھیں۔

جپسی قبروں کے سامنے ایک درخت کے سایہ میں بڑا سا بینچ رکھا تھا۔ میں نے ان تمام قبروں کی تصاویر کھینچیں اور پھر اس بینچ پر اس خیال سے بیٹھ گیا کہ شاید کوئی جپسی خاندان یہاں پھول چڑھانے آنکلے اور ان سے ملاقات ہوجائے۔

یہاں تک کہ دوپہر ڈھلنے لگی۔ مجھے بھوک لگی اور میں نے اپنے سینڈوچوں کا لنچ کیا۔ میں اب تھک کر واپسی کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لمبی سی کار آکر قریب کی قبروں کے پاس رکی، جس میں سے ہندوستانی شکل و شباہت کا ایک جوڑا نمودار ہوا۔ شاید انہوں نے مجھے جپسی سمجھ کر کچھ دیر معنی خیز نظروں سے گھورا۔ اور پھر خاتون ایک طرف اپنے کسی عزیز اقارب کی قبر کی صفائی میں لگ گئی۔ مگر وہ مرد کنکھیوں سے مجھے تاڑتا رہا اور بے چینی سے ادھر ادھر گھومتا رہا۔ مجھے ان کے جپسی ہونے پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ وہ چھومنتر ہوجاتے میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹہلتے ہوئے اس آدمی کے قریب پہنچا۔ اس کا جسم دبلا پتلا اور رنگ گندمی تھا۔ ہندوستان کے کسی بھی علاقے کا ہوسکتا تھا۔ میں نے اسے سلام کیا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے تیزی کے ساتھ اپنے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھتے ہوئے بہت ترش انداز میں مجھ سے سوال کیا۔

"تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں ہندوستانی جپسی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ میں امریکہ میں اپنے جپسی بھائیوں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تو کیا تم رومنی بولتے ہو؟" اس نے مشکوک انداز میں کہا۔

"ہاں میں ہندوستانی رومنی بولتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو بات کرو۔" اس نے کہا۔

میں نے اپنے ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔ ناک' کان' بال۔ ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ ناک' کان اور بال اس نے تجسّس سے کہا۔

"آنکھ" میں نے اپنی آنکھ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"آنکھ؟" اس نے لمحہ بھر کے لئے حیران ہو کر کہا۔

"او! انکھ" اس نے مسکرا کر کہا۔

پھر جوں ہی میں نے اپنی انگلی اپنے ہونٹوں کے طرف اٹھائی تو اس نے فوراً کہا۔

"مونھ"

"ہاں منہ۔" میں نے دہرایا۔

"اچھا۔ اور کچھ بتلاؤ۔" اس نے اب محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"گھر" میں نے کہا۔

"گھر؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ھوم" میں نے انگریزی میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"او! کھر" اس نے پنجابی کا لفظ دہرایا اور ہنس دیا۔

اتنے میں اس کی بیوی بھی آ گئی اور اس نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"یہ ہندوستانی رومنی ہے۔"

"اوہ! ہندوستان! میرے اجداد بھی ایک دن وہیں سے آئے تھے۔" اس کی بیوی نے خوشی سے چہک کر کہا۔

"مگر تم اس قبرستان میں کیا کر رہے ہو؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں جو ان آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے جپسیوں سے خاصہ عاجز آ چکا تھا' انہی کے سے ترش انداز میں کہا۔

"چونکہ یہاں کے زندہ جپسی لوگ اجنبیوں کے ساتھ ملنے سے کتراتے ہیں۔ میں

نے سوچا کیوں نہ ان کے مردوں سے ہی ملتا چلوں۔ "

وہ دونوں کھکھلا کر ہنس دیئے۔ ان کا بے تکلفی کا سہارا لیتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ اس خاتون کی طرف سلام کے انداز میں بڑھایا۔ اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "میرے ہاتھ بہت گندے ہیں۔ میں اپنے ابا کی قبر کی صفائی کر کے آ رہی ہوں۔ "

"کوئی بات نہیں۔ " میں نے اس سے ہاتھ ملانے پر اصرار کیا۔ اور اس نے جھینپتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"تمہیں یہاں کے جپسیوں کے بارے میں کس نے بتلایا۔ " مرد نے پوچھا۔

"نیویارک کے کاسٹیلو نے۔ " میں نے جواب دیا۔

"کون کاسٹیلو؟" یہاں تو ہر دوسرا رومنی کاسٹیلو ہے۔ اس نے مذاقاً" کہا۔

"پیٹی کاسٹیلو۔ نیویارک برونکس میں غالباً" جپسیوں کا سردار ہے اور اس کی بیوی مارتھا قسمت کا حال بتلاتی ہے۔

"اوہ! مارتھا میں اسے جانتی ہوں۔ اس نے اب دھندا کم کر دیا ہے۔ میں بھی ہاتھ دیکھنے کا دھندا کرتی ہوں۔ " اس کی سانولی' سلونی اور گول مٹول بیوی نے مانوسیت کے ساتھ کہا۔

"اچھا' یہ بتلاؤ کہ میں رومنی لوگوں سے کہاں اور کیسے مل سکتا ہوں۔ ؟" میں نے پوچھا۔

"مگر تم ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" وہ پھر سے چوکنا ہو گیا۔

"اس لئے کہ میں انہیں اپنا سمجھتا ہوں اور ان کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ "

"کیا" اس نے پھر منہ پھٹ انداز اختیار کر لیا۔

"یہی کہ ہندوستان سے کب اور کیوں آئے۔ خاص کر رومنی زبان پر راجستھانی اور گجراتی زبان کا بہت اثر ہے۔ میں چونکہ راجستھانی زبان بولتا ہوں شاید رومنی زبان سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک ہزار سال کی خانہ بدوشی میں انہوں نے ابھی تک اپنی زبان ترک نہیں کی ہے اور نہ ہی ہندوستانی طرز

زندگی۔ وہ بہت منفرد لوگ ہیں مجھے ان سے مل کر بے حد خوشی ہوگی۔" میں نے یہ سب کچھ ایک سانس میں اگل دیا۔

"اوہ! تو واشنگٹن ریاست، اوریگن اور کیلفورنیا میں کافی جپسی رہتے ہیں۔ مل لو۔" اس نے سپاٹ سا جواب دیا۔

"مگر کیسے؟ کہاں؟ کوئی راستہ تو بتلاؤ۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"تم ایسا کرو کہ یہاں آج کل روز فیسٹول" کا میلہ جاری ہے۔ بس وہاں چلے جاؤ تم کو بہت سارے رومنی گھومتے پھرتے نظر آئیں گے۔" مرد نے کہا۔

اس عرصہ اس کی دراوڑی شکل و شباہت کی موٹی اور سانولی بیوی کار میں جابیٹھی اور پھر اس نے ہارن بجا کر اسے متوجہ کیا۔ اور بڑی پھرتی کے ساتھ وہ جپسی بھی اپنی کار میں سوار ہوکر ہوا ہوگیا۔ اور میں دیر تک کھڑا ان کے رفوچکر ہونے کا نظارہ کرتا رہا۔

"بے چارے شامی" میں دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ چاہے پاکستان میں ہوں یا پورٹ لینڈ میں اپنے اور پرائے کی شدھ بدھ کھوجانے کے بعد صدیوں سے پردیس میں چوروں کی طرح چھپتے پھرتے ہیں۔ کاش تم سمجھ سکتے کہ میں کون ہوں اور صدیوں سے تمہارے نقش قدم پر تمہاری کھوج نکالنے کے لئے در در بھٹک رہا ہوں۔ میں تمہارے سب دکھ سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میں تم ہی میں سے ایک ہوں۔ قبیلے سے کھویا ہوا تنہا انسان جسے کوئی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اب تم ہی بتلاؤ میں اپنے دکھ کس کے ساتھ بانٹوں؟"

(۱۷)

سیپیاں اور پتھر

سان فرانسیسکو San Francesco کے ساحل پر ایک صبح سویرے میں سیپیاں اور پتھر یا Shells And Stones چن رہا تھا۔ بحر اوقیانوس کی گہری نیلی اور ہرے رنگ کی لہروں میں اس گھڑی کچھ ٹھہراؤ سا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں آج سے کوئی چار سو سال قبل چند ایک ہسپانوی قزاقوں کے سمندری جہاز لنگر انداز ہونے کی کوشش میں رکے تھے' اور ساحل پر کہر کی وجہ سے وہ اس ساحلی کھاڑی کا پتہ لگانے میں ناکام ہوکر لوٹ گئے تھے۔ مگر ہسپانوی پادری جنہوں نے اندلس میں مور نسل کے مسلمانوں کی سات سو سالہ سلطنت کا مکمل صفایا کردیا تھا۔ غالبا" عیسائی بنیاد پرستی اور نشاۃ ثانیہ کے نشہ میں چور' بحری قزاقوں سے زیادہ گہری نظر رکھتے تھے۔ نامور پادری سینٹ فرانسیس اس کھاڑی کے عقب میں پہاڑ کی چوٹی پر پہلے ہی ڈیرے ڈال چکا تھا' جہاں اب اس کی یادگار کے طور پر ایک بہت بڑی پتھر کی صلیب نصب ہے جو میلوں دور سے نظر آتی ہے۔ اس زمانہ میں میکسیکن انڈین لوگوں کے لئے بحری قزاقوں اور پادریوں میں تمیز کرنا مشکل کام تھا۔ اس لئے کہ جہاں نو آباد کار سپاہی ان کی زمین چھین لینے میں ناکام ہوتے وہاں پادری لوگ انکی روح بلکہ ذہن ہی چرا لیتے تھے۔ ان لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آج اس کھاڑی کے گرد پھیلے ہوئے شہر کا نام سان فرانسیسکو ہے۔ اور کھاڑی کی قدیم ترین میکسیکن بستی جہاں انڈین مچھیرے آباد تھے' اب مشن اسٹریٹ Mission Street یعنی تبلیغی جماعت خانہ کی شاہراہ کہلاتی ہے جہاں قدیم قلعہ نما جماعت خانہ اب بھی اس وحشی دور کا تمسخر اڑاتا ہوا کھڑا نظر آتا ہے۔

میں انسانی تاریخ کی ان بھول ۔بھلیوں میں گم صبح ہی صبح اس زمردی ساحل پر سیپیاں اور پتھر چننے میں محو تھا۔ کبھی کبھی انسان بچوں کی سی کیفیت میں ہمیشہ معصوم رہنا چاہتا ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے شروعات میں صبح ہی صبح میں کراچی کے مٹیالے ساحل پر سیپیاں اور پتھر چنا کرتا تھا۔ ۱۹۸۷ء میں بحرالکاہل کے ساحل پر اٹیلانٹک سٹی Atlantic-City کی سیر کے دوران بھی میں نے سیپیاں اور پتھر جمع کئے تھے۔

ساحلی سیپیاں ہمیشہ مجھے فطرت کی صناع کاری کا پتہ دیتی ہیں جبکہ وقت اور پانی کے دھاروں میں گھسے پٹے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے گول اور سڈول پتھر مجھے وقت کی بے انت لہروں میں ڈبو دیتے ہیں۔ اب یہ سیپیاں **اور** پتھر سندھ کے دیہات میں بھیل بستی کے میرے ایک چھوٹے سے گھروندے میں سجے ہیں ان میں ایک بڑا سا سنکھ بھی تھا جو اب بستی کے گھریلو مندر میں رکھ دیا گیا ہے۔ اور روز شام کو پوجا کے وقت پجاری اسے بجا کر دن کے بخیریت خاتمہ کا اعلان بھی کرتا ہے اور رات کے اندھیرے میں ڈوبے خطرات سے ہوشیار بھی۔

۸ جون ۱۹۸۹ء کی ایک سہانی دوپہر کو جب میں سان فرانسیسکو کے ہوائی اڈے پر اترا تو کراچی کے ایک پرانے دوست شاہد حسین نے خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا۔ شاہد حسین نامور ادبی شخصیت مرحوم اختر حسین رائے پوری کا بیٹا ہے۔ ۷۰ء کی دہائی کے آخری سالوں میں سندھ کے دیہات میں تحریکی طور پر وقت گزار کر جب میں نے شہری درمیانہ طبقہ سے نظریاتی رشتہ جوڑنے کی غرض سے کراچی کا رخ کیا تو مرحوم فرخ امین کے قریب ترین ساتھیوں میں شاہد حسین پیش پیش تھا۔ کراچی میں ہم اس زمانہ کی بیشتر نظریاتی بیٹھکیں شاہد کے ہاں ہی کرتے۔ شاہد بہت جیالا ساتھی تھا، مگر تھا بے حد بے صبرا۔ اپنی بحثوں میں ہمیشہ جنوبی امریکہ کی طرز پر اربن گوریلا تنظیم قائم کرنے کی تلقین کرتا۔ جبکہ میں چین کے کسان انقلاب کی طرز پر سندھ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہاریوں کو منظم کرنے کی رٹ لگائے رہتا۔ اس زمانہ میں سندھ کی جاگیردار قوم پرستی ابھی اتنی مضبوط نہیں ہوپائی تھی اور ادھر ضیاء الحق کی فسطائیت انہیں مضبوط کرنے کے درپے تھی۔ ۱۹۸۶ء میں کراچی کے شہر میں لسانی فسادات کا ڈرامہ رچایا گیا اور پھر ان فسادات نے مٹھی بھر ساتھیوں کی رہی سہی کمر بھی توڑ دی۔

جاگیردارانہ قوم پرستی نے فوجی حکمرانوں کی مدد سے سندھ کے شہروں اور دیہاتوں کو لسانی خون میں نہلادیا اور سندھ کے سماجی حالات ایک دفعہ پھر افراتفری کا شکار ہو گئے۔ بھائی' بھائی کا دشمن بن گیا اور پھر پراسرار قاتلوں نے قتل عام کے بازار گرم کردیئے۔ نتیجہ کے طور پر طبقاتی جدوجہد علاقائی قوم پرستی کی نظر ہوگئی۔ کراچی میں اورنگی کا سانحہ ابھی ذہنوں سے نکلا ہی نہیں تھا کہ حیدر آباد میں ایک پرسکون شام کو بقول میرے دوست اے ۔ آر ناگوری کے تیس منٹ میں تین سو لاشیں گرادی گئیں۔ سب خواب بکھر گئے۔ پاکستان میں ابتداء ہی سے شر کی رفتار خیر سے کہیں تیز رہی ہے۔ تقسیم کا خونچکاں ہیولا آنے والے وقتوں میں مقدر بن کر چھاگیا۔ جاگیردار اور فوجی ٹولہ نے ملک کو یرغمال بنالیا اور معاشرہ کی ہر خوبصورت اور تخلیقی حس کو تہس نہس کرکے رکھ دیا۔ خفیہ ایجنسیاں ' ڈرگ مافیا' قانون کے نفاذ کے نام پر لاقانونیت' اسلام کے نفاذ کے نام پر اسلام دشمنی' فسطائیت' انارکی' پولیس ریاست ' چور' ڈاکو اور دہشت گرد اور پھر ان کی آڑ میں ملٹری آپریشن کلین اپ نے بالاخر اس ملک کے روشن مستقبل کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

ساتھی تنکوں کی طرح بکھر گئے۔ فرخ امین اور عارب شیدی جیسی فرشتہ نما شخصیتوں کے لئے اب کوئی جگہ نہیں تھی اور وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ اور شاہد حسین جنہوں نے امریکہ میں تعلیم پائی تھی ایک دفعہ پھر اپنے رومانی نظریات کو خیرباد کہہ کر واپس لوٹ گئے۔ غرضیکہ شاہد حسین اب اپنی امریکن بیوی کے ساتھ سان فرانسسکو میں رہتا تھا' مگر اس کا دل اب بھی اپنی بدنصیب دھرتی کے لئے خون کے آنسو بہاتا تھا۔

شاہد مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوا اور گھر لے گیا۔ شاہد کی بیوی کیرولین حسین' مہذب' مہمان نواز اور موسیقی کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ اب وہ دونوں مل کر پاکستان کے تھیم پر انگریزی موسیقی کی ایک البم تیار کرنے میں مصروف تھے۔ البم کے گیت کیرولین حسین نے اپنی تمام تر فنکارانہ لگن کے ساتھ میٹھی اور مدھر دھن میں گائے تھے۔ ان گیتوں میں پردیس میں پھنسی ہوئی نوجوان نسل کا المیہ بھی تھا اور حب الوطنی اور ذاتی محبت کے درمیان ہلکا سا کھچاؤ بھی۔ مگر موضوعی اعتبار سے ان گیتوں میں

امید اور نیک تمناؤں کا اظہار تھا۔

“سچ تو یہ ہے کہ متلاشی روح
کتنی دور بھٹک جاتی ہے
مگر سچائی؟ وہ تو اس کے اندر ہے۔
مجھے تھام لو پھر سے اپنی باہوں میں
ہم اب کبھی جدا نہ ہوں گے”

شاہد، کیرولین کے ساتھ سان فرانسیسکو سٹیٹ یونیورسٹی کے قریب ایک چھوٹی سے خوبصورت اپارٹمنٹ میں رہتا تھا اور اگلے کوئی تین ہفتہ ان کے اصرار پر میں نے وہیں ڈیرہ ڈالے رکھا۔ شاہد نے جو ایک میوزیکل ادارے میں مارکیٹنگ کا ڈائریکٹر تھا میرے آنے کی خوشی میں چند ایک دن چھٹی لے کر دن بھر مجھے اپنی کار میں بٹھا کر شہر کی سیر کراتا رہا۔

سان فرانسیسکو کا شہر امریکہ کے دیگر شہروں سے بہت مختلف ہے۔ یہاں کی عمارتیں قدر چھوٹی چھوٹی مگر بے حد خوبصورت تھیں۔ بیشتر گھروں اور کھڑکیوں کے دروازے محرابی شکل کے تھے اور ان کے سامنے الحمراء کے طرز پر ستون لگے ہوئے تھے مجموعی اعتبار سے شہر کا کردار ہسپانوی تھا۔ اور اسی نسبت سے لوگ انڈین نژاد، سانولے اور دھیرے مزاج کے تھے۔ سال بھر موسم خوشگوار رہتا، مگر یہاں کی گرمیاں قدر خنک تھیں۔

سان فرانسیسکو کی سب سے مخصوص بستی “گے” Gay لوگوں پر مشتمل تھی جو کاسٹرو اسٹریٹ کے نام سے مشہور تھی۔ گے لوگ اغلام بازوں کو کہا جاتا تھا۔ کاسٹرو اسٹریٹ کے یہ گے لوگ عورتوں سے شادی کرنے اور روایتی انداز میں گھر بنانے کو بہت برا سمجھتے تھے۔ مرد جوڑوں کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے جن میں ایک کا کردار مرد کا ہوتا اور دوسرے کا رول عورت کا۔ وہ زیادہ تر پڑھے لکھے، پیشہ ورانہ طور پر باصلاحیت اونچے اور درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس علاقہ میں ان کے بہت شاندار مکانات، دکانیں اور ریسٹوران وغیرہ تھے۔ ان ریسٹورانوں اور کلبوں میں عورتیں نام کو بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ یہاں لیسبین Lesbian عورتوں کے اپنے

مخصوص علاقے تھے اور یہ عورتیں بھی مردوں سے شادی کرنے یا ان کے ساتھ رہنے کو بہت برا خیال کرتی تھیں۔ لیسبن عورتیں بھی جوڑے کی صورت میں ایک ساتھ رہتی تھیں جن میں کپڑے لتوں اور چال ڈھال کے انداز میں ایک عورت لگتی اور دوسری کچھ مرد نما۔ یعنی ایک خاوند تو دوسری بیوی۔ عورتوں کی ان مخصوص سوسائٹیوں میں بھی مرد پر نہیں مار سکتے تھے۔

Gay گے سوسائٹی کے بارے میں ایک خیال یہ بھی مشہور تھا کہ جب کیلیفورنیا میں سونا دریافت ہوا' جس کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں اور جب یورپی چور اچکوں نے اس علاقہ پر دھاوا بولا تو یہ لوگ زیادہ تر مرد تھے اور اگر ان مہم جو لوگوں کے ساتھ عورتیں تھیں بھی تو راتوں رات امیر بن جانے کے خواب دیکھنے والی حرافائیں تھیں۔ لہٰذا مار دھاڑ' سونے کی ریل پیل اور لوٹ کھسوٹ کے اس دور میں ان لوگوں میں ہم جنسیت اسی طرح عود کر آئی جس طرح طویل المعیاد فوجی مہموں کے دوران فوجی کیمپوں اور بارکوں میں عام ہوجاتی ہے۔ خیال ہے کہ ابتداء میں یہ رجحان چوری چھپے جاری رہا اور پچھلی کئی دہائیوں میں مغربی جمہوریت کی آزادی کے سہارے منظر عام پر آگیا۔ اب Gay لوگوں کی کھلی تنظیمیں ہیں۔ اپنے اخبار ہیں اور اپنے علاقوں میں اپنی مخصوص بود و باش ہے۔ اس وقت جب میں وہاں تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے لئے نئے سماج میں باعزت مقام کے خواہاں تھے بلکہ ہم جنس جوڑے کے لئے شادی بیاہ اور جائیداد کی وراثت کے حقوق کو قانونی شکل دینے کی جدوجہد میں بھی مصروف تھے۔

عام طور پر Gay لوگ بہت امن پسند ہوتے ہیں مگر ان دنوں Gay لوگوں پر سخت عتاب نازل تھا۔ اس لئے کہ امریکہ میں ایڈ Aid جیسے موذی مرض کی ایک وجہ گے لوگوں کی ہم جنس پرستی کو قرار دیا جارہا تھا۔ گو Gay لوگ اس الزام تراشی کو جھوٹ کا پلندہ اور ان کی جنسی آزادی کے خلاف ایک قدغن تصور کرتے ہیں۔ مگر بحث اور جدوجہد ابھی جاری ہے۔ اور گے لوگ وقتاً" فوقتاً" امریکہ کے طول و عرض میں اس الزام کے خلاف احتجاج کرتے رہتے ہیں۔

بہرحال میں نے کاسترو اسٹریٹ پر گے لوگوں کا بغور جائزہ لیا۔ مردوں کو ایک

دوسرے کے ساتھ سرعام چوماچاٹی کرتے ہوئے بھی دیکھا اور ایک دوسرے کے بغل میں ہاتھ ڈال کر مزے سے گھومتے ہوئے بھی دیکھا۔ مگر داڑھی مونچھوں والے ہٹے کٹے جوڑوں کو خاوند بیوی تصور کرنا میری سمجھ سے یکسر بالا تھا۔

شہر کے بیچوں بیچ ایک چینی بازار ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سان فرانسیسکو کے چینی باشندوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بہت زیرک اور ہوشیار بیوپاری ہیں اور گورے لوگوں سے جائیداد اور تجارت چھین کر اپنے ہاتھوں میں لیتے جارہے ہیں۔ یہ چینی لوگ بھی سونے کی دریافت کے زمانہ میں سونے کی کانوں میں کام کرنے، ریلوے لائن بچھانے کی خاطر مزدوری کرنے کے لئے نیم غلامی کی صورت میں چین سے لائے گئے تھے۔ اب یہ چینی اپنی محنت اور فہم و فراست کی وجہ سے یہاں کی صنعت و حرفت پر چھاتے جارہے ہیں۔

البتہ مشن اسٹریٹ کے انڈین لوگوں کی حالت اب بھی بہت خستہ تھی۔ وہ کالے لوگوں کی طرح معاشرے کی نچلی ترین سطح پر کام کرتے تھے یا یوں کہیئے کہ زندہ تھے چونکہ وہ اس دھرتی کے قدیم ترین باشندے ہیں اس لئے گورے نو آباد کار انہیں بہت دبا کر رکھتے ہیں اور اتنی آسانی سے انہیں معاف کرنے پر تیار نہیں۔

شہر کے مغرب میں گولڈن گیٹ کے پار سوسالیتو نام کی ایک بہت خوبصورت اور امیر لوگوں پر مشتمل گوری بستی ہے۔ یہاں گورے نو آباد کاروں کا اونچا طبقہ رہتا ہے جہاں چینی اور ہسپانوی نژاد لوگ نوکری چاکری کے سوا پر نہیں مار سکتے۔ یہاں گہری ہریالی اور خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں گورے نو آباد کاروں کے بڑے بڑے بنگلے ہیں جن کی قیمت ملین کے حساب سے ڈالروں میں ہوتی ہے اور جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کی کھاڑی ان لوگوں کی ذاتی کشتیوں سے بھری ہوتی ہے اور بہت ہی حسین منظر پیش کرتی ہے۔

یہ قیمتی کشتیاں جو دو چار لاکھ ڈالر مالیت کی ہوتی ہیں، کشتیاں نہیں بلکہ مکمل بحری سفری جہاز ہوتی ہیں اور جو محض سیر و تفریح کے کام آتی ہیں۔ ان میں گھر کا تمام آرام و آسائشیں کا بندوبست ہوتا ہے۔ جب میں شاہد حسین کے ساتھ سوسالیتو کی سیر کے لئے گیا تو اس بستی کی چمک دمک دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ پھر شاہد نے اپنا مخصوص جملہ دہراتے

ہوئے کہا۔

"کیوں، خورشید! کیسا لگا سان فرانسیسکو تمہیں؟ دیکھ لو۔ گورے لوگوں نے اپنے لئے زمین پر جنت بنالی ہے اور اپنا اللہ ہی حافظ ہے۔"

(۱۸)

الماماتر

سان فرانسیسکو کے مشرقی حصہ میں کھاڑی کو عبور کرنے کے لئے کوئی سات میل لمبا پل سانپ کی طرح بل کھاتا چلا گیا ہے جو بے برج Bay Bridge کہلاتا ہے۔ یہ پل شہر کو برکلے کی بستی سے ملاتا ہے۔ اس بستی میں کیلیفورنیا کی مشہور برکلے یونیورسٹی قائم ہے۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے قانون کی ڈگری اسی یونیورسٹی سے حاصل کی تھی اور یہیں سے اپنے سیاسی دور کا آغاز بھی کیا تھا۔ میں نے شاہد کے ساتھ پورا ایک دن اس یونیورسٹی میں سیر سپاٹے کی غرض سے گزارا۔ اس کے احاطہ میں ویٹنام پارک ہے جہاں سے امریکہ کی بڑی بڑی نامور تحریکیں ابھریں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ایک باغی' گورا دانشور نوجوان سنڈے کا تیل بیچنے والے پٹھان کی طرح مجمع لگائے' چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔

"یہ گوری حکومت محض ٹیکس جمع کرنے کا ادارہ ہے۔ اسے ٹیکس مت دو۔ یہ نئی نازی حکومت ہے۔ آج چین میں کیا ہو رہا ہے؟" وہ بے لگام بولتا گیا۔

" نکسن جب چین گیا۔" بذریعہ پاکستان' میں نے لقمہ دیا۔ "ہاں' پاکستان کے ذریعہ' تو اس نے ماؤزے تنگ کو پتہ ہے کیا کہا؟ "اس نے لمحہ بھر کے لئے رک کر مجمع پر ایک فاتحانہ نظر دوڑائی۔" اس نے کامریڈ چیئرمین ماؤ سے کہا کہ آپ چینیوں کو محض ایک دن کے لئے کوکا کولا پینے کی اجازت دے دو' یعنی ایک بلین Billion کوکا کولا کی بوتلیں جس کی پہلی کھیپ ہم مفت بھجوانے کو تیار ہیں اور بقیہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ معلوم ہے پھر کیا ہوا' دیکھتے ہی دیکھتے کوکا کولا چینیوں کے لئے کوکین بن

گیا۔

"دینگ زاؤ پنگ حال ہی میں امریکہ آیا تھا' تو کیا وہ یہاں پینگ پونگ کھیلنے آیا تھا؟" مجمع نے زور سے ہنس کر داد دی۔ "چین میں آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ سی۔ آئی۔ اے CIA کا کیا دھرا ہے۔" وہ بے لاگ بولتا گیا۔

"چینی طلبا کو تین مین اسکوئر' سے ہٹانا چینیوں کا اندرونی مسئلہ تھا۔ مگر امریکن ٹیلی ویژن رات اور دن یوں پروپیگنڈا کرنے میں جت گیا' جیسا کہ خدانخواستہ وہاں امریکی طالب علموں کا قتل ہوا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ چینی طلبا کو اکسانے اور المیہ کھڑا کرنے میں انہیں کا ہاتھ ہو۔ کیوں؟ اس لئے کہ امریکہ ایک طویل عرصہ سے بحالی جمہوریت کی آڑ میں' چین کی منڈی پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔"

وہ سانس لینے کے لئے ذرا دیر رکا تو فرط جوش میں اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہے تھے اور مجمع بڑے اشتیاق سے اسے سن رہا تھا۔

"پتہ ہے' آج کے امریکی تاجر کا سب سے بڑا خواب کیا ہے؟ چین کی ایک بلین نفوس کی منڈی میں کچھ نہ کچھ بیچنا۔ اور وہ کچھ نہ کچھ اگر گدھے کی لید بھی ہوئی تو وہ سمجھتا ہے کہ راتوں رات بلینئر یعنی کروڑ پتی بن جائے گا۔ مگر یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ماضی میں یہ "کچھ نہ کچھ" "عموماً" گلا سڑا پلاسٹک یا لوہے کا جنک Junk یعنی ڈھیر ہوتے ہیں جن کو امریکن کروڑوں ڈالر کی تجارت بنا کر تیسری دنیا کی منڈیوں میں ڈمپ کردیتے ہیں۔ کبھی جنگ کے نام پر پرانے ہتھیار تو کبھی امن اور آزادی کے نام پر دیگر گھریلو کوڑا کرکٹ۔ امریکہ کی آزادی کا تصور حقیقت میں تجارت کی آزادی کا ہی دوسرا نام ہے۔ لہٰذا کوئی بھی سوشلسٹ ملک جو اپنی آزادی اور سالمیت کو داؤ پر لگا کر امریکہ کے پلاسٹک' الیکٹرونک فیڈ Fad اور فیکس Fax خریدنے کو تیار نہیں' وہ امریکہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتے اور امریکہ کیمونزم کا ہوا کھڑا کر کے انہیں تباہ کرنے پر تلا رہتا ہے۔ یقین کیجئے' یہ ہے امریکہ کی جمہوریت اور اس کی آزاد منڈی کا سب سے بڑا تصور۔ اسی لئے تو امریکی حکومت' کوریا' ویٹ نام' بیروت' عرب اسرائیلی جنگوں' گرینا ڈا' نکارا گوا اور سان سلواڈور جیسے بحران خود ہی کھڑے کرتی رہتی ہے اور پھر ان کی آڑ میں ہتھیاروں کی بین الاقوامی تجارت کی حفاظت کرتی رہی ہے۔ چاہے اس کے

لئے کتنے ہی لوگ قربان کیوں نہ کرنا پڑیں۔ کچھ لوگ اگر امریکہ کو سفید شیطان کہتے ہیں تو بلاوجہ ہرگز نہیں۔

مگر ویتنام میں جتنے امریکی قربان ہوئے اس سے انہوں نے ایک سبق ضرور سیکھا ہے کہ ایشیا کے کسی ملک میں گورے لوگوں کو نہ بھیجا جائے' کیوں کہ جلتی میں تیل کا کام کرتے ہیں۔ اور یہ کہ انہیں انسانی جانوں کی صورت میں بہت بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ لہٰذا نئی حکمت عملی یہ ہے کہ ایشیائی کو ایشیائی سے لڑائے رکھو۔ اسی لئے تو انہوں نے دو کوریا' ذو ویتنام' اور تین ہندوستان (بھارت' پاکستان' بنگلہ-دیش) جنم دیئے۔ یہی صورت حال کم یا زیادہ افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں بھی ہے۔ کبھی وہاں کسی ملٹری جرنل کو خرید کر تو کہیں جمہوریت کے نام پر اپنے پٹھو جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ کی مدد سے' اب ان ممالک میں دیسی لوگوں کو دیسی طبقات کی مدد سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ یعنی ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے۔

"خیال فرمائیے' جرنل مارکوس اور جرنل ضیاء جیسے چلے ہوئے کارتوسوں کی جگہ اب باقی نہ رہی تو مادام اکینو اور مادام بھٹو جیسی خواتین کو سامنے لارہا ہے۔ امریکی چچا سام کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"

وہ لمحہ بھر کے لئے رکا۔ پارک میں ادھر ادھر بیٹھے لوگ ہنس ہنس کر اس کو داد دے رہے تھے۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ چند طالب علم اس کی تقریر سے بے نیاز دھیرے دھیرے پاس سے گزر رہے ہیں۔ اس نے انہیں للکار کر مخاطب کیا۔

"اے لڑکو' تم چار سال تک اپنی محنت کی کمائی برکلے کے ان حرام خوروں کو کھلاتے رہتے ہو۔ علم حاصل کرنے کے لئے۔ مگر پورے چار سال یہ تم سے جھوٹ بولنے کے سوا تمہیں کچھ نہیں سکھلاتے اور بلاخر جب تم گریجویٹ بن کر یہاں سے نکلتے ہو تو تم پہلے سے بھی زیادہ جاہل ہوتے ہو۔ مت دو یہ بھاری فیس ان کو بلکہ مجھے دو یہ پیسے اور میں چار دن میں تمہیں اتنا کچھ سکھلا دوں گا کہ جو انہوں نے چار سال میں نہیں سکھلایا ہوگا۔"

ایک دفعہ پھر مجمع میں زوردار قہقہہ پھوٹ پڑا۔ اس نے فاتحانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کی شریر نظریں ہم پر مرکوز ہوگئیں۔

”یہ پاکی بہت اچھے لوگ ہیں۔ اور ان کی حکومت بھی اتنی ہی اچھی ہے جتنی اسرائیل یا مصر کی حکومتیں۔ یہ تین ممالک امریکہ کے سب سے زیادہ قابل اعتبار اتحادی ہیں۔ اور امریکہ انہیں منہ مانگے ڈالر دیتا ہے۔ اسرائیل اور پاکستان کو تو امریکہ نے جمہوریت اور آزادی کی نشوونما کے لئے اتنا کچھ دیا ہے کہ ان کی نسلیں یاد رکھیں گی۔ مگر بے چارے یہ پاکی بہت ہی اچھے ہیں۔ اگر امریکہ انہیں ٹھکرا بھی دے تو بھی برا نہیں مانتے۔ ہر حکومت بڑی فرمانبرداری کے ساتھ واشنگٹن کا خطبہ پڑھتی رہتی ہے۔ کیوں نہیں، امریکہ نے انہیں آزادی اور جمہوریت کا سبق بھی تو پڑھایا ہے۔

”آزادی؟ جمہوریت؟“ میں نے احتجاج کیا۔

”ہاں آزادی۔ کیا تمہارے ملک میں قتل کی آزادی نہیں ہے؟ کیا پچھلے چند سالوں میں کراچی اور حیدر آباد کے شہروں میں ہزاروں لوگ قتل نہیں ہوئے؟ کیا حکومت نے آج تک کسی کو پکڑا؟ کوئی انکوائری ہوئی؟ کیا اصل قاتلوں کے چہرے سے نقاب آج تک اترا؟ کیا قاتلوں کو مکمل آزادی کے ساتھ قتل کرکے اطمینان کے ساتھ رفو چکر ہوجانے کی آزادی نہیں دی گئی؟ تو جناب حقوق انسانی کے سلسلہ میں قاتل کو قتل کرنے کی آزادی دینے سے بڑی جمہوریت اور کیا ہوسکتی ہے؟

”اور ہاں آپ کے ساتھ تو ہمارے رشتے بہت گہرے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے قانون کی ڈگری اسی یونیورسٹی سے حاصل کی تھی اور امریکہ کے ایما پر اس کا تختہ ہوجانے کے باوجود بے نظیر بھٹو نے اس تخت کی سرخ روئی سے کبھی منہ نہ موڑا۔ یہ بے چارے پاکی بہت ہی فرمانبردار لوگ ہیں۔“ مجمع ہنس رہا تھا میں اور شاہد حسین شرم کے مارے پانی پانی ہوکر وہاں یوں بت بنے کھڑے تھے کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

(۱۹)

لوس اینجلس

لوس اینجلس کا لفظی مطلب ہے فرشتوں کا شہر۔ مگر جس تعداد میں یہاں مسلح چور، ڈاکو رہتے ہیں۔ اس سے تو اس کا نام شیطانوں کا شہر ہونا چاہیے۔ ایک اندازے کے مطابق لوس اینجلس میں مسلح مجرم گروہوں کی تعداد ۹۰ ہزار کے قریب ہے۔ یعنی، کناڈا کی باقاعدہ فوج سے بھی زیادہ۔

۱۶ جون، جمعہ کے دن میں گرے ہاؤنڈ Grey Hound بس میں سوار ہو کر لوس اینجلس کے لئے روانہ ہوا۔ کیلفورنیا کو سنہری ریاست بھی کہا جاتا ہے اور سنگتروں کا دیش بھی۔ دن بھر بس گاڑی بڑے بڑے فارموں اور رانچوں کے بیچ دوڑتی رہی۔ یہ فارم خاص طور پر سنگتروں، انگور، بادام، پستے اور چیری وغیرہ کے لئے مشہور تھے۔ اس کے علاوہ یہاں ہر قسم کی سبزیاں بھی اگتی تھیں۔ کوئی دو سو میل سفر طے کرنے کے بعد چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلے شروع ہو گئے اور گاڑی چومس کے پہاڑوں پر چڑھنی شروع ہو گئی اس علاقہ میں محض ایک سو سال قبل چومس نام کے انڈین قبائل آباد تھے اور ان کی چھوٹی بستیوں کو رانچریوں کہا جاتا تھا۔ اب ان انڈین لوگوں اور ان کے رانچریوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں تھا۔ بلکہ اب ان کی جگھوں پر پہاڑوں کی زرخیز ڈھلوانوں اور میدانوں کو لوہے کی تاروں کی باڑھ سے حد بندی کر کے گورے نو آباد کاروں نے بڑی بڑی ذاتی رانچیں قائم کر رکھی تھیں۔ ان رانچوں میں بڑے بڑے کوٹ بنے تھے، جس کے گرد سینکڑوں کی تعداد میں گھوڑے، گائیں، بھیڑ بکریاں اور لاما Lama چرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دراہ تیجون کوئی ۴۱۰۰ فٹ کی بلندی پر تھا، جسے

تیجون پاس کہتے تھے۔ قریب ہی تیجون کا قلعہ بھی تھا جو ۱۸۵۳ء میں غالباً" انڈین لوگوں کی سرکوبی کے لئے قائم کیا گیا تھا اور ان کی نسل کشی کے آخری نشان کے طور پر کھڑا عبرت ناک نظارہ پیش کرتا تھا۔

شام ہوتے ہوتے ہماری گاڑی شمالی ھالی ووڈ Holly Wood میں داخل ہوئی۔ یہ وہی ھالی ووڈ تھا جہاں دنیا کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری کا مرکز ہے۔ گاڑی لمحہ بھر کے لئے رکی تو ایک فلپینی بوڑھا اندر داخل ہوا اور میرے بازو والی سیٹ پر آبیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس کا نام تھا' "فلپین کا مارکوس"۔ اچٹتی سی ایک نظر ڈالتے پر میں نے دیکھا کہ کتاب کے اندر والے پہلے خالی صفحہ پر مارکوس نے آٹوگراف کے طور پر بقلم خود لکھا تھا۔ "پیارے سیزور کے لئے' خلوص کے ساتھ۔" ہوائی۔

"صدر مارکوس اب کیسا ہے۔ ھوائی میں ہی ہے نہ؟" میں نے گفتگو شروع کرنے کی غرض سے کہا۔

"ہاں! اب بھی زندہ ہے' مگر بہت بیمار ہے۔ میری لڑکی کا گھر ہوائی میں اس کے گھر کے ساتھ ہی ہے۔ میری عمر کیا ہوگی؟ مارکوس مجھ سے چھوٹا ہے۔ دراصل میرے چھوٹے بھائی کا دوست ہے۔ سیزور اور مارکوس ایک ساتھ وکیل تھے۔ فلپین میں بہت بڑا جج رہا ہے۔ اب بھی ہوائی میں ہی ہے۔" فلپینی بوڑھا بہت باتونی تھا اور بلا چھوٹ بولنا شروع ہوگیا۔

"میری لڑکی یہاں ڈاکٹر ہے۔ اس کا گھر سانٹا باربرا میں ہے۔ صدر ریگن کے گھر سے محض تین میل کے فاصلہ پر۔ اب میں بیٹی کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔ میں اتنا بوڑھا نظر نہیں آتا جتنی میری عمر ہے۔ میں نے ۱۹۳۳ء میں فلپین میں ابتدائی تعلیم مکمل کی (اتفاق سے یہ میرا جنم سال تھا) میں سوگز کی تیز دوڑ کا فلپینی چیمپئن بھی رہا ہوں۔ پھر میں امریکہ چلا آیا اور دوسری جنگ عظیم میں امریکی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ کب؟ جب امریکیوں نے جاپانیوں کے عقب میں ایک چھاتہ بردار فوج کو فلپین میں اتارنے کا فیصلہ کیا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ تب مجھے جنرل میکارتھر سے ہاتھ ملانے کا شرف بھی حاصل ہوا۔" فلپینی بوڑھا بے لگام بولتا گیا۔

میں نے گاڑی کی کھڑکی سے باہر جھانک کر شہر پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور امریکہ کے

شہروں کا مخصوص اور میکانکی نقشہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہی مشن اسٹریٹ یا پادریوں کی گلی ۔ ھولی ووڈ یعنی مقدس جنگل، جہاں اب دنیا کے سب سے بڑے قمار خانے اور رنڈی خانے تھے۔ بے شک اس مقدس جنگل کو انڈین لوگوں کے قدیم وجود سے پاک کرالیا گیا تھا۔ ایک بڑے سے گرجا گھر پر لکھا تھا First-Assembly Of God یعنی اللہ کے پیاروں کا پہلا اجتماع۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی دکان پر لکھا تھا "پنجاب آٹو پارٹس" ہمارے لوگ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرکے ازراہ مذاق کہا اور زور سے ہنس دیا۔

لوس اینجلس میں اپنے دو دن کے قیام کے دوران ایک پورے دن ڈزنی لینڈ اور ھالی ووڈ کے یونیورسل اسٹوڈیو کی سیر کرتا رہا، دوسرے دن زاہد قریشی نے اپنی کار میں میکسیکو کا سرحدی شہر ٹوانہ دکھایا۔

ڈزنی لینڈ اور یونیورسل اسٹوڈیو کے تفصیلی ذکر کے لئے تو الگ سے ایک کتابچہ درکار ہے اور جو میرے لئے یہاں ممکن نہیں۔ مگر مختصراً" اتنا بتلاتا چلوں کہ یونیورسل سٹوڈیو میں جگہیں اور فلمی سیٹ ضرور دیکھے جہاں الفریڈ ہچکوک اور اورسن ویلز وغیرہ نے اپنی مشہور زمانہ فلموں کی فلم بندی کی تھی اور جہاں کنگ کانگ، جاز Jaws سیمسن ڈیلائلہ اور سائکو Psycho جیسی مارکتہ العاراء فلمیں تیار ہوئی تھیں۔ یہاں اب بھی مصنوعی مکانات اور عکس بندی کے لئے تیار کئے گئے عارضی سیٹ کھڑے تھے جن کو مارلن منرو، گریگری پیک، الزبتھ ٹیلر اور مارلن برانڈو جیسے اداکاروں نے کبھی مخصوص فلم میں کوئی مخصوص کردار ادا کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ یہاں وہ تھیٹر بھی دیکھے جہاں مائیکل جیکسن اور میڈونا جیسی مشہور ہستیاں اپنے گانے فلم بند کرواتے تھے۔

لوس اینجلس ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کوئی ایک سو میل کی لمبائی میں بہت بے تکے طور پر پھیلا ہوا تھا۔ نظام خاں نے مجھے ڈزنی لینڈ اور یونیورسل اسٹوڈیو دکھلایا اور زاہد قریشی نے میکسیکو کی سیر کرائی۔ گو کہ یہ پاکستانی حضرات ایک عرصہ دراز سے لوس اینجلس کے شہری تھے مگر ان کے درمیان اتنا فاصلہ تھا جتنا کہ حیدر آباد اور کراچی والوں کے درمیان ہوتا ہے۔

امریکہ میں پاکستانیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اکثر حالات میں اباسیاں لیتے، تھکن سے چور نظر آتے اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتیں۔ بیشتر پاکستانی محنت و مشقت کرکے پیٹ پالتے تھے، جس میں شرم کی کوئی بات نہیں تھی۔ مگر وہ ہمیشہ اپنے پیشہ کی اصلی نوعیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے۔ ایک صاحب نے اپنے گھر والوں کو پاکستان میں لکھا کہ ڈی سی D.C بن گیا ہے۔ گھر والے اس کے لئے بر ڈھونڈنے کی غرض سے گھر گھر بدھائی کی صورت میں مٹھائی بانٹتے پھرے۔ تو پتہ چلا کہ امریکہ میں صاحب زادے کو ڈش کلینز یعنی ہوٹل میں برتن دھونے کی نوکری مل گئی ہے۔ حقیقت کو چھپانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستانی معاشرہ بے حد رجعت پرست ہے اور رجعت کے خلاف کسی چیز کو ابھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک پاکستانی نوجوان پورنوگرافی کی ایک دکان پر کام کرتا تھا۔ جہاں ننگی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ دوسرے پاکستانی نے اس کے ہونے والے سسرال میں یہ خبر اڑادی کہ ننگی فلموں میں کام کرتا ہے اور اس بے چارے کی منگنی ٹوٹ گئی۔

ایک پاکستانی نے میرے دوست خالدی سے پوچھا۔ ”جی، تسی وی میرے ونگوں دیوار ٹپ کے آئے ہو؟“ اس سے اس کا اشارہ ان بھگوڑے جہاز رانوں کی طرف تھا جو کسی سمندری جہاز پر نوکری حاصل کرکے کیوبا آتے اور پھر میکسیکو میں. سرحدی دیوار عبور کرکے امریکہ میں داخل ہوتے اور غائب ہوجاتے۔ ان لوگوں کو اکثر اوقات امیگریشن سے بچنے کے لئے عبرت ناک تجربات سے گزرنا پڑتا۔ غرضیکہ مجھے اکثر پاکستانی اپنے حالات سے انتہائی ناخوش نظر آتے اور ان میں کسی حد تک وہ بھی شامل ہوتے جو کامیاب سمجھے جاتے تھے۔ اس کی غالباً“ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گورے نو آباد کاروں کا رہن سہن ہی کچھ ایسا تھا جس میں پاکستانی یا ہندوستانی تو کیا کسی بھی مشرقی ممالک کے لوگوں کے لئے پوری طرح ضم ہونا دشوار تھا۔ یہ لوگ گھر، کاریں، ٹیلیفون، ٹیلیویژن وغیرہ عام قسطوں پر حاصل کرلیتے، مگر پھر بقیہ عمر بھر ان کی قیمت چکانے میں لگے رہتے۔ اوُر اگر غلطی سے ایک آدھ قسط ادا کرنے میں ناکام ہوتے تو پولیس آکر انہیں نکال باہر کرتی۔ اس لئے وہ چار و ناچار کام، کام اور بس کام کی ایک ایسی چکی میں پستے رہتے جس سے صرف ان کی دیہاڑی پوری ہوتی اور چھٹکارہ حاصل کرنا ممکن نہ ہوتا۔

اور ایسے میں [redacted] بھاگ کر [redacted]طن لوٹ بھی آتے تو وہاں کیا کرتے۔ اب ان کی عادات و اطوار بھی تو کتنی بدل گئی تھیں۔ نتیجہ کے طور پر [redacted] اہل خانہ اور وطن کے لئے ہر وقت کڑھتے رہتے۔ وطن لوٹنے کے محض خواب دیکھتے اور [redacted] خواب اب اتنے ہی مشکل اور دور رس تھے جتنے ایک دن امریکہ پہنچنے کے لئے نظر آتے تھے۔

(۲۰)

میکسیکو کی سیر

بحری قزاق کرسٹوفر کولمبس نے ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو پہلے پہل جنوبی امریکہ کے ایک جزیرے سان سلواڈور پر قدم رکھا تھا۔ اس کے بعد اگلی چند صدیوں وہاں کے قدیم باشندوں پر کیا بیتی، اس کا مختصر حال میں "بھٹکتی نسلیں" میں دے چکا ہوں۔ اور آج سان سلواڈو کے جزیرے پر ڈھونڈنے سے بھی شاید ہی کوئی خالص انڈین نژاد مل سکے۔

میکسیکو، کولمبیا اور پیرو Peru قدیم امریکی دنیا کے نہایت ترقی یافتہ تہذیبی مراکز تھے۔ میکسیکو کی "آزٹیک تہذیب" کولمبیا کی "انقا تہذیب" اور پیرو کی "مایا تہذیب" کسی بھی صورت میں دنیا کی دیگر ہم عصر تہذیبوں سے کم نہ تھیں۔ مگر ہسپانوی حملہ آوروں نے اگلی چند دہائیوں کے اندر اندر انہیں تہس نہس کردیا تھا۔ بحری قزاق کورتے Corte میکسیکو میں اور پیزارو Pizzaro پیرو کی تباہی کے لئے بہت بدنام ہوئے۔

غرض کہ ہسپانوی نو آباد کاروں نے جنوبی امریکہ کی پوری دنیا میں اس قدر ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا کہ لوگوں کو صفاء ہستی سے ہی مٹا دیا اور جو بچ رہے وہ اب ہسپانوی ہی کہلاتے ہیں۔ مگر اس پوری بدقسمت دنیا میں میکسیکو واحد ملک تھا جہاں کی انڈین آبادی نے ہسپانوی مظالم سے جلد ہی سبق سیکھا اور پھر اسی شدت سے اس کا جواب بھی دیا۔ میکسیکن لوگوں نے نہ صرف کامیاب مزاحمتیں کیں بلکہ زپاٹا Zapata جیسے انقلابی کی قیادت میں کسان انقلاب بھی برپا کیا۔ گو اب پیرو میں بھی کسان انقلاب برپا ہے اور "شائننگ پاتھ" Shining Path نام کی ماؤ نسٹ انقلابی تحریک حکومت سے

نبرد آزما ہے مگر میکسیکو میں انقلابی مزاحمت کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔ وہاں بہت پہلے سے ہر گورے امریکن کو حقارت میں "گرینگو" اور ہر ہسپانوی نو آباد کار کو "میکسیکن" کہتے ہیں۔

میکسیکو کے لوگ اب بھی اس حقیقت کو بھلا نہیں پائے ہیں کہ محض ایک صدی قبل گورے امریکی نو آباد کاروں نے کیلیفورنیا۔ اریزونا Arizona اور ٹیکساس وغیرہ نام کے ایک بڑے علاقہ کو ان سے زبردستی چھین کر اس کے ایک حصہ کا نام نیو میکسیکو رکھ دیا اور پھر بچے کھچے میکسیکو کو بھی للچائی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اور اب ان کی سستی محنت خرید کر ان کا بری طرح استحصال بھی کرتے ہیں۔ مگر شاید فطرت وقت آنے پر اپنا انتقام ضرور لیتی ہے۔

میکسیکو اور امریکہ کے مابین ہزاروں میل لمبی سرحد قائم ہے جسے گو امریکیوں نے بند کر رکھا ہے مگر ان کے لاکھ جتن کرنے کے باوجود مفلس انڈین آبادی سرحد عبور کرکے امریکہ پہنچتی رہتی ہے۔ ان کی منطق کے مطابق ایک دن ان کا یہ علاقہ بھی تو غیر قانونی طور پر ان سے چھین لیا گیا تھا۔ اور اب وہ اپنے ہی علاقہ میں نقل مکانی کررہے ہیں۔ یوں بھی غربت پانی کے بہاؤ کی طرح چلتی ہے اور اسے روکنا ممکن نہیں۔ جنوبی امریکہ کی یہ انڈین آبادی اب اس دیسی آبادی کا خلاء پورا کر رہی ہے جسے گورے لوگوں نے نو آباد کار دور میں ختم کردیا تھا۔ فی الحال امریکی حکومت ان غیر قانونی تارکین وطن کی آمد کو مکمل طور پر روکنے کے لئے سنجیدہ بھی نہیں۔ کیونکہ امریکن دیو ہیکل پیداواری مشینوں اور پرزوں کو چلائے رکھنے کے لئے سستا انسانی ایندھن درکار رہتا ہے۔ جسے گورے لوگ مہیا نہیں کرسکتے۔ لہٰذا امریکی حکومت ان غیر قانونی تارکین وطن کا جس کی اکثریت امریکہ کے پہاڑوں اور دیہاتوں سے آئے ہوئے انڈین قبائل کی ہوتی ہے، خوب خوب استحصال کرتی ہے۔ یعنی سستی اجرت اور ڈبل محنت۔ مگر یہ انڈین اس دھرتی کو ایک بار پھر ایشیائی رنگ میں رنگ دینے میں ضرور مصروف ہیں۔

ایک سہانی صبح لوس انجلیس سے زاہد قریشی، علوی صاحب اور میں کار کے ذریعہ میکسیکو کے لئے روانہ ہوئے۔ سانٹا باربرا سانٹافے اور سان ڈیاگو سے ہوتے ہوئے جب

ہم میکسیکو کی سرحد کے قریب پہنچے تو سڑک کے دائیں جانب بحر اوقیانوس کی ہریالی ساحلی لہروں کا شور صاف سنائی دیتا تھا۔ کچھ دیر کے لئے ہم ساحل پر رکے' جہاں انڈین لوگ دستکاری کی بنی چیزیں فروخت کررہے تھے۔ ساحل کی طرف دوڑتی لہروں پر سوار ٹھنڈی پون نے لپٹ کر ہمارا سواگت کیا۔ ٹیالے شفق کی چادر میں لپٹا ہوا گہرا نیلا اور پراسرار سمندر خاموش ہل چل کے ساتھ موجزن تھا۔ لمحہ بھر کے لئے اس ساحل پر کھڑے مجھے یوں لگا جیسے وہ کوئی حقیقت نہیں خواب تھا۔ سچائی نہیں سپنا تھا۔

تاحد نظر پھیلا ہوا سسکتا' بے انت سمندر جس کے دل کی گہرائیوں میں کتنے انسانی المیے غرقاب تھے۔ ان سمندری لہروں پر سوار بحری قزاقوں کی یلغار اور بھولے بھالے' پستہ قد اور سانولے رنگ کے مچھیروں کی آہ و پکار ہماری طرف دوڑتی مشتاق لہروں کے لبوں سے صاف سنائی دیتی تھی۔ حسب عادت میں نے آنکھیں موند لیں اور بحر اوقیانوس کی مقناطیسی جاذبیت کے زیر اثر تحلیل سا ہوگیا۔

نیند سے بوجھل اور تھکاوٹ سے چور خاموش طبع زاہد قریشی نے اپنی کار امریکہ کی سرحد پر ہی کھڑی کردی اور ہم نے پیدل سرحد عبور کرنے کا پروگرام بنایا۔ کیونکہ بقول زاہد میکسیکن لوگ امریکنوں کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے اور ذرا سی غلطی یا ایکسیڈنٹ کی صورت میں امریکی اور اس کی کار دونوں لاکپ میں پہنچ جاتی تھیں اور بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

"مگر زاہد ہم تو بالکل میکسیکن ہی لگتے ہیں۔ اگر کچھ ہو بھی گیا تو وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ہم گرینگو تھوڑے ہی ہیں؟" میرا خیال تھا کہ زاہد کار کو سرحد پار لے چلتا اور ہم تھوڑا بہت میکسیکو کے دیہات کا جائزہ لے سکتے۔ مگر زاہد کے چہرے پر پرخوف گھمبیرتا دیکھ کر میں نے اصرار نہیں کیا۔

سرحدی دروازے پر کسی قسم کی چیکنگ نہیں تھی اور ہم بلا روک ٹوک ٹیوانہ کے اندر داخل ہوگئے۔ ٹیوانہ کیا تھا بس کراچی ہی تھا۔ ہر طرف لوگوں کی ریل پیل' سڑکوں کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے انڈین گداگر عورتیں اور بچے جو بالکل ہمارے گداگروں سے ملتے جلتے تھے اور کچھ نیم خانہ بدوش گنواریہ عورتوں اور بچوں کی طرح اپنی ٹوکریاں سامنے زمین پر رکھے دستکاری کا سامان بیچ رہے تھے۔ میں نے ازراہ

ہمدردی اور یادداشت کے طور پر ان سے ہاتھ کا کڑا اور کھلونا نما سومبریرو Sombrero ہیٹ خریدا۔ سڑک کے دونوں طرف دکانیں بھی ہمارے بازاروں کی طرح تھیں۔ یعنی چھوٹی چھوٹی، تنگ اور لوگوں سے اٹی ہوئی۔ میں نے ایک دوکان سے پونچو Poncho خریدا جو اب بھی میری الماری میں محفوظ ہے۔ پھر سڑک پر کھڑے ایک ٹھیلے سے چٹ پٹی چاٹ کھائی جس میں آم، اناس، سنگترہ، تربوز، گرما اور انگور شامل تھے اور اوپر دبا کر لال مرچیں اور گرم مسالہ چھڑکا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ میکسیکن کھانوں میں مرچ مسالہ بھی بالکل ہمارے ملک جیسا ہی تھا۔ اور امریکہ کے مقابلے میں یہاں کا طرز زندگی، رہن سہن، اشیاء کی قیمتیں، شکل و شباہت اور دیگر عادات و اطوار بالکل مشرقی لوگوں کی مانند تھیں۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ امریکی سرحد پار کرنے کے محض چند سو گز کے فاصلے پر ہم گورے مغرب کی جاں توڑ مشینی گہما گہمی سے نکل کر مشرق کی سست رفتار مگر پرسکون اور کھڑی ہوئی زندگی میں داخل ہوگئے تھے۔ اور کھانا پینا اتنا سستا تھا کہ دس امریکن ڈالر کے عوض ہم تینوں نے پیٹ بھر کر میکسیکن کھانا کھایا، جس میں دال، چاول، بھنا مرغ سموسے اور روٹیاں بالکل ہمارے کھانوں کی طرح تھیں۔

کچھ دیر شاہراہ انقلاب Revolutionary Boulevard پر مٹر گشت کرنے کے بعد ہم زپاٹا چوک پر پہنچے۔ گورے امریکیوں کی خاطر ہر طرف عیاشی کے اڈے، ریستوران اور ناچ گھر کھلے تھے جن میں اونچی آواز میں موسیقی کی دھن پر ناچتے امریکی سیاح، میکسیکن انقلاب اور ویوا، زپاٹا Viva Zapata کا مذاق اڑاتے نظر آئے۔ یعنی امریکی سرحدی دیوار پار کرتے ہی، تیسری دنیا کا مخصوص نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ کراچی ہو یا میکسیکو، فلپین ہو یا کہ بنکاک، امریکی بادشاہ جہاں جہاں دوست بن کر پہنچا تھا، ڈراپ سین ایک جیسا ہی تھا۔ یعنی مغربی دھن پر ناچتا چھوٹا سا طبقہ جس کو سب کچھ میسر تھا اور دوسری طرف بھوک، بیماری، اور ظلم کی ماری ہوئی کالے، کلوٹے کچلے ہوئے عوام جن کا جینا تک دوبھر تھا۔

میکسیکو کے سیاسی حالات بھی ان دنوں پاکستان جیسے ہی تھے۔ یعنی ایک طرف بڑی بڑی زمینداریاں، تیل کے کنویں اور ان پر پلتے ہوئے اجارہ دار طبقات جن کی اصل

طاقت کا محور چرس کی سمگلنگ تھی اور یا پھر فوج و پولیس و ریاست کی انتظامیہ۔ دوسری طرف کارڈینہ نام کی نام نہاد بائیں بازو کی پارلیمانی جمہوری پارٹی تھی جس کو آنے والے انتخابات میں وہی مقبولیت حاصل تھی جو پاکستان میں پیپلزپارٹی کو حاصل رہی ہے۔ یعنی لوگ اسے ووٹ اس لئے نہیں دیتے تھے کہ وہ ان کے مسائل کا حل تھی بلکہ لوگ اسے حکومت وقت کے خلاف احتجاجا" ووٹ دیتے تھے۔ ظاہر ہے ان احتجاجی ووٹوں کو کلی طور پر اس پارٹی کی مقبولیت ٹھہرانا سراسر غلطی ہے اور تیسری دنیا میں یہ غلطی سامراجی حکمت عملی کے طور پر بار بار دہرائی جارہی تھی، جس میں فلپین، پاکستان، میکسیکو مثالی ممالک کہے جاسکتے ہیں۔

بہرحال، جیسا کہ انتخابات سے قبل ترقی پذیر ممالک میں اکثر ہوتا ہے، حکومت اور حزب اختلاف کارڈینہ پارٹی دونوں ہی ایک دوسرے پر دھاندلی اور تشدد کے ذریعہ ووٹروں کو ڈرا دھمکا کر بھگادینے کا الزام لگارہے تھے۔

میکسیکو شہر کے مغرب میں باجا میچولن کی ریاست غالبا" میکسیکو کی اکتیس ریاستوں میں سے غریب ترین ہے۔ اسی لئے دیوار پھاند کر امریکہ گھس جانے والے تارکین وطن کی اکثریت اسی علاقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طرح میکسیکو نہ صرف یہ کہ امریکی معاشرہ کی دکھتی رگ ہے بلکہ اس کی سرحد کے پار کسی بھی وقت پھٹ جانے والا ٹائم بم بھی ہے۔ لہٰذا امریکہ کسی صورت میں بھی میکسیکو کی طرف سے آنکھیں بند کرلینے کا متحمل نہیں۔ موجودہ صورت میں دیوار پھاند کر آنے والے غیر قانونی تارکین وطن ایک طرف تو امریکہ کو کوڑے کے بھاؤ مزدور مہیا کرتے تھے اور دوسری طرف میکسیکو اور دیگر جنوبی امریکہ کے ممالک کے اقتصادی و سماجی ٹائم بم کی گیس بھی خارج کرتے رہتے ہیں۔

میرے لئے ذاتی طور پر یہ ایک دلچسپ انکشاف سے کم نہ تھا کہ اکثر میکسیکن لوگوں نے مجھے شکل و صورت کے اعتبار سے میکسیکن ہی سمجھا، اور بیشتر نے مجھ سے ہسپانوی زبان میں بات چیت کرنے میں پہل کی۔ مگر جب میں انہیں انگریزی میں جواب دیتا تو وہ پہلے تو حیران ہوتے اور پھر ان کے چہروں کے تاثرات پیار کی بجائے حقارت میں بدل جاتے۔ تب مجھے وہ گتھی بھی سمجھ میں آئی کہ کرسٹوفر کولمبس نے

یہاں کے قدیم باشندون کو انڈین یا ہندوستانی کیوں کہا تھا۔ اور یہ کہ غلطی سے اس سرزمین کو ہندوستان کیوں سمجھ بیٹھا تھا۔ آخر میں' مجھے اس بات پر بھی دکھ ہوا کہ ہم آقا کی زبان انگریزی تو فر فر بول لیتے ہیں اور وہ بھی عمر بھر احساس کمتری کے تحت گورے لوگوں کی نقالی کرنے کے لئے۔ مگر ہسپانوی زبان سیکھنے پر مجھے ایک براعظم کے لوگوں کے ساتھ بھائی چارے اوز برابری کی بنیاد پر خیر سگالی ہی نہیں پیار بھی مل سکتا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ اگر مجھے زندگی پھر سے ملی تو میں ہسپانوی زبان ضرور سیکھوں گا۔

(۲۱)

پونکہ چیف کا مقدمہ

۴ جولائی کا دن غالباً" امریکہ کی آزادی اور دستور کی بالادستی کے طور پر منایا جاتا ہے۔ دن بھر پارکوں میں ناچ‘ گیتوں کی بڑی بڑی محفل گرم کی جاتی ہیں۔ اور شام کے وقت آتش بازی کا نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۹۷۳ء میں جب میں واشنگٹن ڈی سی میں تھا تو اس دن میں نے ریڈ انڈین لوگوں کے ایک بہت بڑے اجتماع میں شمولیت کی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ریڈ انڈین لوگوں نے اس دن خوشی منانے کی بجائے ماتم کرنے کا اعادہ کیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے "گورے نو آباد کاروں کی تاریخ میں آج آزادی اور فتح کا دن ہے‘ مگر ہم قدیم امریکی باشندوں کے لئے یہ شکست و ریخت اور موت کا قومی دن ہے۔ ہم زندہ رہنا چاہتے تھے مگر ہالی ووڈ کے جان وین John Wayn کے سامنے ہماری ایک نہ چلی۔ آؤ مل کر قومی سوگ منائیں۔"

اس کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ اس مجمع میں جو بھی انڈین نژاد لوگ موجود ہوں‘ ان سے درخواست ہے کہ [illegible] اپنے اسلاف کی یاد میں یہاں آئیں اوز اپنے قومی ناچ میں شامل ہو کر ان کی روحوں کو دوام بخشیں۔ میرے ارد گرد بیٹھے ہوئے چند ایک گورے لوگوں میں سے ایک عورت نے ہنس کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"کیوں‘ کیا تم اپنے لوگوں کے قومی ناچ میں حصہ نہیں لو گے؟" تب مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے میری شکل و شباہت کے اعتبار سے ریڈ انڈین ہی سمجھتے ہیں اور میں اس حسن اتفاق پر انہیں مایوس کرنے کی بجائے اٹھا اور بڑے فخر کے ساتھ جھومتا ہوا میدان

کے بیچ قائم ریڈ انڈین مرد اور عورتوں کے بڑے سے گول دائرے میں شامل ہوگیا۔ اور پھر ایک دوسرے کی کمر اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دیر تک اس دائرے میں ناچتے رہے۔ میرے لئے انسانی درد بانٹنے کا یہ عظیم دائرہ تھا۔ ناچ کے اختتام پر جب میں واپس اپنی جگہ پر آیا تو انہی گورے لوگوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "کہو' کیسے لگا اپنے لوگوں کے ساتھ ناچتے ہوئے؟"

"بہت عظیم۔" میں نے جواب دیا۔ "اتنا عظیم کہ جس کا اظہار یہاں ممکن نہیں۔"

اس بار جب میں نیویارک مین تھا تو شام پڑنے پر ہڈسن دریا کے کنارے آتش بازی کا منظر بہت مسحور کن تھا۔ رات گئے' ٹیلی ویژن پر واشنگٹن ڈی سی سے ایک بہت بڑی موسیقی کی سمفنی Symphony دکھلانے کا اہتمام کیا گیا جو کہ کیپٹل بلڈنگ اور واشنگٹن مونومنٹ کے درمیان بڑے پارک میں ہوئی تھی اسی رات ریڈ انڈین لوگوں کے ایماء پر ٹیلی ویژن پر ایک فلم دکھائی گئی جس کا نام تھا۔ "پونکہ چیف سٹینڈنگ بیر Standing Bear کا مقدمہ۔" چونکہ یہ کہانی کہنا چاہیے کہ گھوڑے کی زبانی Hores Mouth قومی میڈیا پر نشر ہوئی اس لئے یہاں اس کا مختصر بیان ضروری سمجھتا ہوں۔

تحقیق کے مطابق چالیس ہزار سال سے قدیم قبائل جنہیں اب ریڈ انڈین کہا جاتا ہے اس سرزمین پر خوش و خرم آباد تھے جو اب ریاست ہائے متحدہ امریکہ کہلاتی ہے۔

کچھ انتہائی پرامن اور مہذب انڈین نیراسگا کے علاقہ میں بھی رہتے تھے جہاں ہرے بھرے پہاڑوں' جھرنوں ' جھیلوں اور زرخیز میدانوں کی بہتات تھی۔ ضرورت کے مطابق یہ انڈین لوگ اناج اگاتے اور مچھلیوں کا شکار کرتے اور فطرت کے ساتھ مکمل ہم آہنگی مین زندگی بسر کرتے۔ صدیاں یوں ہی بیتتی رہیں۔

پھر ایک ایسا دن آیا جب ایک آسمانی آفت کی طرح گورے لوگ ان پر آن نازل ہوئے۔ یہ گورے لوگ انتہائی گھٹیا' لالچی ' جرائم پیشہ اور بحری قزاق تھے اور کسی بھی قسم کی انسانی اخلاقیات سے عاری تھے۔ اپنی آمد کے چند ایک برسوں کے اندر ان لوگوں نے بیماری ' غلاظت اور تشدد کے ذریعہ انڈین لوگوں کی فطری زندگی کو تہہ و بالا کرنا

شروع کردیا۔ اور اس سے پہلے کہ انڈین لوگوں کو ان کی اصل نیت کا پتہ چلتا' گورے نو آباد کاروں نے انہیں مسلح فوجوں کے ذریعہ گھیر لیا۔ کئی خونی معرکے رونما ہوئے بالاخر ۱۸۷۰ء میں ایک معاہدہ کی رو سے یہ طے پایا کہ یا تو انڈین لوگ اس علاقہ کو چھوڑ کر جنوب کی طرف چلے جائیں جسے انڈین سرزمین Indian Territory قرار دیا گیا تھا اور یا پھر قتل عام کے لئے تیار ہوجائیں۔ بیشتر انڈین لوگوں نے اپنی دھرتی پر جان دینے کو ترجیح دی۔ مگر نیراسگا کے پونکہ قبیلے کا سردار سٹینڈنگ بیر بہت صلاح پسند انسان تھا' اس نے اپنے قبیلے کو بچانے کی غرض سے ہزاروں میل دور جنوب کی طرف امریکی حکومت کے قائم کردہ مخصوص علاقہ میں چلے جانے کے لئے رضامندی ظاہر کردی۔ نئی سیٹلمینٹ اسکیم کے تحت ان قبائل کے لئے جنوب کے دور دراز علاقہ میں جانے اور بنجر زمین کو پھر سے آباد کرنے کا کل خرچ اور دیگر انتظام حکومت کو کرنا تھا مگر حکومت نے ان خانماں برباد لوگوں کی بحالی کے لئے کوئی خاص امداد نہ کی۔ جب پونکہ انڈین نئی سرزمین پر پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ وہ زمین آباد کاری کے لئے بالکل ناقص ہے نتیجہ کے طور پر بھوک' بیماری اور نامناسب آب و ہوا کی وجہ سے انڈین لوگ ایک ایک کرکے مرنا شروع ہوگئے۔ ایک دن اسٹینڈنگ بیر کی ننھی بچی فوت ہوئی اور اس کے چند دن بعد اس کا جواں سال لڑکا بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگیا۔ مگر بیٹے نے مرنے سے پہلے ماں اور باپ دونوں سے وعدہ لیا کہ اگر وہ مرجائے تو اسے اس کے اپنے علاقہ' نیرا اگا میں اس کی قبائلی سرزمین پر اسی جگہ دفن کیا جائے جہاں ایک دن اس کا گھر تھا۔ ایک دن سٹینڈنگ بیر نے اپنے قبیلے کو جمع کیا اور کہا۔

"ہم نے جب بھی گورے لوگوں پر بھروسہ کیا انہوں نے ہمیں دھوکا دیا۔ یہ نیا علاقہ ہمارے لوگوں کے لئے موافق نہیں ہے۔ صرف دو سال کے اندر اندر ہمارے پانچ سو افراد میں سے تقریباً" ایک تہائی مرچکے ہیں حکومت نے غالباً" ہمیں یہاں مرنے کے لئے ہی بھیجا تھا۔ اسی لئے آج تک ہمیں حکومت کی کوئی امداد نہیں پہنچی' جس کا انہوں نے معاہدے کی رو سے وعدہ کیا تھا۔ اگر ہمیں مرنا ہی ہے تو کیوں نہ اپنی سرزمین پر جاکر مریں۔ میں نے اپنے مرحوم بیٹے کو وچن دیا تھا کہ میں اس کی ہڈیاں' نیراساگا میں اپنے گھر میں دفن کروں گا۔ سینکڑوں میل لمبا سفر بہت طویل ہے اور ہمیں موسم سرما

کی برف باری کے دوران یہاں سے نکلنا ہوگا تاکہ گوری فوج ہمارا پیچھا کرنے سے قاصر رہے۔ جو لوگ یہاں رہنا چاہیں بے شک رہیں۔ مگر جو لوگ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہیں وہ سفر کی تیاری شروع کردیں۔"

"مگر سٹینڈنگ بیر۔" ایک انڈین نے کہا۔ "ہمارے پاس کھانے پینے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے گھوڑے بھی زیادہ تر ہلاک ہوچکے ہیں۔ ایسے میں ہم بے سروسامان بھوکے پیاسے اتنا طویل سفر کیسے طے کریں گے؟ اول تو ہم سب لوگ یا تو راستہ میں ہی کام آجائیں گے اور اگر اپنی منزل مقصود پر پہنچ بھی گئے تو گوری فوج شکاری کتوں کی طرح ہمارا پیچھا کرتی وہاں پہنچ جائے گی۔"

"ہاں' یہ صحیح ہے۔" سٹینڈنگ بیر نے کہا۔ "موت تو ہر صورت میں ہمارا مقدر نظر آتی ہے۔ مگر ہم یہاں بے بسی کی حالت میں ایڑیاں رگڑ کر مرنے کی بجائے اپنی کھوئی ہوئی سرزمین کی جدوجہد میں مریں تو وہ موت بلامقصد نہیں ہوگی۔ اور شاید اس طرح ہم بچ بھی جائیں۔

بالاخر' چار و ناچار کوئی ایک درجن خاندان سٹینڈنگ بیر کے ساتھ ہولیے۔ ایک گھوڑا گاڑی تھی جس پر سٹینڈنگ بیر کی بوڑھی بیوی کے ساتھ بیٹے کا تابوت رکھ دیا گیا۔ چند ایک گھوڑے تھے جن پر بوڑھی عورتیں اور کچھ بچے سوار کرادیئے گئے تھے اور بقیہ سب پیدل چل پڑے جب موسم سرما کی برف باری ختم ہوئی تو یہ انڈین لوگ جنگلوں اور بیابانوں سے ہوتے ہوئے پانچ سو میل کا سفر طے کرچکے تھے۔ اور جن حالات میں یہ سفر طے کیا گیا۔ وہ فوجی مہم کے اعتبار سے ناقابل یقین مہم قرار دی جاسکتی ہے جس میں وہ کتنی ہی بار مرتے مرتے بچے۔ ایک سہانی صبح بالاخر یہ لٹا پٹا قافلہ اوماھہ Omaha انڈین کی ریزرویشن میں داخل ہوا۔ اوماھہ ریزرویشن Reseravation میں صرف ایک مکان پکا تھا اور وہ تھا گرجا گھر جس میں ایک گورا پادری انڈین بچوں اور بڑوں کو عیسائی بنانے اور گورے لوگوں کی طرز زندگی میں ڈھالنے میں لگا ہوا تھا۔

اوماھہ لوگوں نے پونکہ لوگوں کی بہت آؤ بھگت کی انہیں پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جو انہوں نے کئی دن سے نہیں کھایا تھا۔ گرم کپڑے دیئے اور ان کے لئے نئی ٹاپریاں بنائیں۔ جب گورے پادری کو پتہ چلا تو اس نے حیران ہوکر پوچھا۔

"سٹینڈنگ بیئر! تم یہاں کہاں؟ پونکہ لوگوں کی نئی سرزمین تو جنوب میں ہے۔؟"

"ہاں تعجب ہے!" سٹینڈنگ بیر نے کہا۔ "گورے پادری تو حکومت کے اہلکاروں سے بھی زیادہ باخبر ہیں۔"

پادری نے فوراً" فوج کو پونکہ قبیلے کی نقل مکانی کی اطلاع دے دی۔

دوسرے دن صبح سویرے علاقہ کے فوجی حاکم جرنل کوک کے سپاہیوں نے پونکہ قبیلے کے لوگوں کو گھیرلیا اور سٹینڈنگ بیر کو گرفتاری کے لئے حاضر ہونے کا حکم دیا تاکہ اسے جرنل کوک کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ چند ایک انڈین لوگوں کے پاس چاقو تھے جن سے انہوں نے فوجیوں کے خلاف مزاحمت کرنی چاہی' مگر سٹینڈنگ بیر نے انہیں روک کر فوجیوں سے کہا۔

"یہاں خون بہانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم پرامن طریقہ پر جرنل سے ملنے کے لئے تیار ہیں۔" حکم کے مطابق سٹینڈنگ بیر اور اس کے ساتھیوں کو جرنل کوک کے سامنے پیش کیا گیا۔

"سٹینڈنگ بیر' تم اور تمہارے قبیلے کے لوگوں نے انڈین ٹریڑی چھوڑ کر حکومت کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے' جس کی سزا بہت سنگین ہے۔" بوڑھے جرنل کوک نے اکڑ کر کہا۔

"موت سے زیادہ سنگین تو نہیں۔" سٹینڈنگ بیر نے بھی انڈین چیف کی سی فلسفیانہ الفاظ میں تزک واحتشام کے ساتھ جواب دیا۔" حکومت نے بھی ہمارے ساتھ معاہدے کی شرائط پوری نہ کرکے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ جس سے ہمارے بے شمار لوگ ہلاک ہوئے۔ اس کا سزاوار کون ہے؟ وہاں کی زمین ناقص ہے حکومت نے ہمیں کوئی امداد بہم نہیں پہنچائی۔ اس لئے ہم اپنی جان بچانے کے لئے اپنے علاقہ میں واپس لوٹ آنے کے لئے حق بجانب ہیں۔"

"مگر تم یہاں پہنچے کیسے؟" جرنل کوک نے حیران ہوکر پوچھا۔ "اوماہہ اور انڈین ٹریڑی کے درمیان تو کم سے کم پانچ سو میل کا فاصلہ ہے۔"

"ہاں یہ سفر ہم نے پیدل طے کیا ہے۔" چیف نے جرنل کو گھورتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا! پیدل؟" جرنل کوک بھونچکا ہوکر رہ گیا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ تم نے موسم سرما کی برف باری میں بے سروسامانی میں یہ سفر پیدل طے کیا؟ ناممکن!"

"ہاں بالکل پیدل۔ کیوں کہ ہمارے بیشتر گھوڑے بھی مرچکے تھے۔" سٹینڈنگ بیر نے بڑے فخر کے ساتھ اپنے ساتھیوں پر ایک عقابی نظر ڈالی۔

جرنل کوک دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام کر کچھ دیر یوں بیٹھا رہا جیسے اس کے پیروں تلے سے یکلخت زمین کھسک گئی ہو۔ پھر وہ سنبھلا اور اپنے چہرے پر بناوٹی سی اکڑ پیدا کرکے کہنے لگا۔

"سٹینڈنگ بیر حکومت کے احکامات کے مطابق تمہیں واپس انڈین ٹریڑی جانا ہوگا۔"

"کیا! واپس جانا ہوگا؟" ایک انڈین نوجوان نے احتجاجاً کہا۔

"ہمارے بچے کھچے گھوڑے لنگڑے ہوچکے ہیں۔ ہمارے لوگ بھی طویل سفر کی بھوک و پیاس اور اذیتوں کی وجہ سے سخت نڈھال ہیں۔ ہم واپس کیسے جاسکتے ہیں؟"

"اسی طرح جیسے تم یہاں پہنچے۔؟" جرنل کوک نے کہا۔ "میں اس معاملہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ حکومت کا حکم ہے تمہیں فوراً واپس بھیج دیا جائے۔"

مگر جرنل کوک جو بوڑھا پیشہ ور فوجی تھا، قبیلے کی جرات مندانہ اور دانش مندانہ مہم سے اتنا متاثر ہوا کہ پس پردہ اس نے ان انڈین لوگوں کی مدد کرنے کا تہیہ کرلیا اور اس نے اپنے ایک صحافی دوست ٹام کو بلایا اور کل ماجرا سنایا۔ ٹام نے سٹینڈنگ بیر اور اس کے ساتھیوں سے ملاقات کی اور ان کی بپتا سن کر کہا۔

"سٹینڈنگ بیر، اگر تم یہ اعلان کردو کہ تم نے انڈین قبیلے کو خیرباد کہہ دیا ہے اور یہ کہ تم اب سردار بھی نہیں رہے بلکہ اب تم گورے لوگوں کی طرح عام شہری کی حیثیت میں بقیہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو تمہاری آزادی کے دستوری حقوق کے لئے عدالت میں لڑا جاسکتا ہے۔

"ہم نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔" سٹینڈنگ بیر نے کہا۔ "مگر یہ سچ ہے کہ ہم نیراساگا واپس جاکر اپنی زمینوں پر کاشت کاری کرنا چاہتے ہیں اور گورے لوگ بھی تو وہاں اب یہی کرتے ہیں۔"

”صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے۔“ ٹام نے کہا۔ امریکی دستور کی رو سے قبیلے کی صورت میں رہنے والے انڈین لوگ امریکی شہری نہیں ہیں بلکہ محکوم اقلیت اور حفاظت طلب بچوں کی مانند ہیں۔ اور ان کو شہری حقوق حاصل نہیں ہیں اور یہ کہ وہ محض حکومت کی مقرر کردہ ریزرویشن میں ہی رہ سکتے ہیں، ان سے باہر نہیں۔“

”بچوں کی مانند ہیں ہم؟“ سٹینڈنگ بیر نے حقارت سے ٹام کی طرف دیکھا۔

”ہاں، امریکی دستور یہی کہتا ہے۔“ ٹام نے کہا۔ ”اور ہمیں تمہاری آزادی کے لئے دستوری جدوجہد کرنی ہوگی اور تمہیں اس سلسلہ میں جیسے میں نے بتلایا اعلان کرنا ہوگا کہ اب تمہارا انڈین قبیلے سے کوئی تعلق نہیں اور تم بقیہ زندگی گورے لوگوں کے دستور کے مطابق گزارنا چاہتے ہو۔“

”کیا گورے لوگوں کے سینگ ہوتے ہیں جو ہم انڈین کو نہیں ہیں؟“ سٹینڈنگ بیر کے نوجوان بھتیجے نے فخر کے ساتھ کہا۔

”ہم پونکہ انڈین ہیں اور اس پر ہمیں فخر ہے۔ اگر گورے لوگوں کی طرز زندگی کا مطلب جھوٹ بولنا، منافقت و مکاری سے پیش آنا ہے اور پھر گدھوں کی طرح کام کرکے شہری غلاظتوں کے ڈھیر پر سسک سسک کر جان دینا ہے تو یہ ہمیں قبول نہیں ہے۔ ہم پونکہ لوگ ہیں اور مرتے دم تک پونکہ ہی رہیں گے۔

”اس صورت میں، امریکی دستور کے مطابق تمہیں جیلوں کی سی کیفیت میں انڈین ٹریٹری میں ہی رہنا ہوگا اور واپس اس علاقہ میں جانا ہوگا جو اب تمہارے لئے مخصوص کردیا گیا ہے۔ سوچ لو، تم چاہو تو عدالت میں مقدمہ دائر کرکے تمہاری واپسی روکی جاسکتی ہے۔“

اس پر سٹینڈنگ بیر اور انڈین لوگوں نے معنی خیز نظروں سے کچھ دیر ایک دوسرے کو گھورا اور پھر ٹام کی طرف دیکھ کر چار و ناچار رضامندی کا اظہار کردیا۔

ٹام نے بظاہر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے سپریم کورٹ کے ایک جج سے بھی بات کرلی ہے اگر ہم مقدمہ اس کی عدالت میں پیش کریں تو وہ ہماری مدد کے لئے تیار ہے۔ چند ایک اور دوستوں نے بھی ہماری مالی اعانت کا وعدہ کیا ہے اور جرنل کوک بھی اس معاملہ میں ہمارے ساتھ ہے۔“

اس کے بعد صحافی ٹام نے جبس بے جا کی درخواست پر اسٹینڈنگ بیر اور بقیہ انڈین لوگوں کے دستخط کروائے اور عدالت میں مقدمہ دائر کردیا۔ عدالت میں مقدمہ کے دوران سرکاری وکیل نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ اسٹینڈنگ بیر اور اس کے پونکہ انڈین ساتھی' غیر قانونی طور پر انڈین ٹریڑی سے بھاگے ہوئے لوگ تھے جبکہ ٹام اور اس کے ساتھی وکیلوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسٹینڈنگ بیر نہ تو اب پونکہ قبیلہ کا سردار تھا اور نہ ہی یہ انڈین اب پونکہ قبیلے کا حصہ تھے' بلکہ اب یہ چند ایک افراد تھے جنھوں نے قبائلی زندگی کو خیرباد کہہ کر عام گورے شہری لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اور دستور کے مطابق اب وہ امریکی شہری تھے اور اپنی موجودہ نقل مکانی کے لئے آزاد تھے۔

چند دن کے ڈرامائی عدالتی قانونی کارروائی کے بعد عدالت نے اسٹینڈنگ بیر اور اس کے ساتھیوں کو امریکی شہری قرار دے کر بری کردیا۔ مگر آزاد قرار پاتے ہی ان کے لئے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ جیسے ہی یہ انڈین عدالت سے باہر آئے تو کمشنر برائے انڈین امور جو عدالتی کاروائی میں حاضر تھا' اس نے پونکہ انڈین لوگوں کو مخاطب کرکے کہا۔

"اسٹینڈنگ بیر' حقیقت میں تم یہ مقدمہ ہار گئے ہو۔ کیونکہ اب تم انڈین نہیں رہے' لہٰذا اب تم نہ ہی انڈین ٹریڑی میں واپس جاسکتے ہو اور نہ ہی کسی دوسری انڈین ریزویشن میں۔ یعنی اب تک تم کو معاہدوں کی صورت میں جو اقلیتی حقوق حاصل تھے تم وہ بھی گنوا بیٹھے ہو۔"

اسٹینڈنگ بیر اور اس کے ساتھی' گمشدہ لوگوں کی طرح تذبذب میں پریشان کھڑے یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اب وہ یہاں سے جائیں تو کہاں جائیں کہ اتنے میں ٹام کے بوڑھے ساتھی وکیل نے مشورہ دیا۔

"اسٹینڈنگ بیر' ابھی ایک جگہ باقی ہے جہاں تم آزاد شہری کی حیثیت میں جاسکتے ہو اور وہ ہے نیراساگا کا دریائی جھیلوں کا وہ علاقہ جہاں انڈین اور گورے دونوں ہی لوگوں کو ماہی گیری کے حقوق حاصل ہیں۔ لہٰذا تم وہاں چلے جاؤ جہاں تم آزاد بھی ہوگے اور اپنے انڈین وجود کو قائم بھی رکھ سکو گے۔"

اس طرح اسٹینڈنگ بیر اور اس کے ساتھی اپنی ہی سرزمین پر پردیسیوں کی طرح بھٹکتے بھٹکتے اپنی اسی قدیم قطعہ ارض پر پہنچے جہاں سب سے پہلے انہوں نے اپنے مرحوم بیٹے کی ہڈیوں کو اس کی وصیت کے مطابق دفن کیا۔ تب اسٹینڈنگ بیر کی بوڑھی بیوی نے بیٹے کی قبر پر دعا پڑھ کر کہا۔

"بیٹے! ہم نے سینکڑوں میل کی مسافت اور سالہاسال کے دکھ درد کے بعد تیری ہڈیوں کو وہیں لا کر دفن کیا جو تم نے زندگی میں چاہا تھا --- گو کہ ہمیں ابھی پتہ نہیں کیا کچھ جھیلنا ہے۔ مگر آج ہم خوش ہیں کہ تیری روح آج کتنی آزاد اور خوش ہوگی!"

(۲۲)

نجمہ آئیشے

نجمہ آئیشے کا تعلق حیدر آباد دکن کے بنجارا خانہ بدوشوں سے تھا۔ اب وہ نیویارک میں رہتی تھی اور جپسی کہلاتی تھی۔ اس کا شوہر یونانی جپسی تھا، جس کا نام لازارو ھری سیادی تھا اور موسیقی کے پرانے آلات کی خرید و فروخت کا دھند کرتا تھا۔ نجمہ کتھک ناچ کی نامور رقاصہ تھی اور مین ھیٹن کے آس پاس کے امریکی سکولوں میں بچوں کو ناچ سکھانے پر معمور تھی۔ مجھے نجمہ کے بارے میں اس وقت پتہ چلا جب میں ۱۹۸۷ء میں پہلے پہل مانٹریال آیا۔ تب میرے میزبان دوست سیم نیوموف نے آئرلینڈ ٹیلیفون کرکے کسی دوست جپسولوجسٹ کے ذریعہ نیویارک کے جپسیوں کے بارے میں میرے لئے اطلاعات فراہم کیں۔ جب میں نے نجمہ کو مانٹریال سے ٹیلیفون پر رابطہ کرکے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے خانہ بدوشوں کی سی اردو زبان میں ٹال مٹول کرتے ہوئے کہا وہ نیویارک کے قریب ہی نیوجرسی میں ناچ سکھلانے کے سلسلہ میں بہت مصروف ہے۔ چونکہ اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد میں پاکستان لوٹ رہا تھا، اس لئے میں نے اصرار کرنے کی بجائے یہ کہا کہ اگر میں اگلی بار پھر نیویارک آیا تو اس سے ضرور ملوں گا۔

۱۹۸۹ء میں ٹورانٹو یونیورسٹی میں جپسی کانفرنس کے سلسلہ میں جب میں یہاں دوبارہ آیا تو مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ نجمہ آئیشے کو نیویارک میں میری موجودگی کا علم تھا۔ وہ اس طرح کہ ڈائنا تونگ Diana Tong نام کی ایک جپسولوجسٹ Gypsologist خاتون جس کا تعلق نیویارک سے تھا اور جو ہمارے ساتھ ٹورانٹو کانفرنس میں شامل

تھیں ان کا نجمہ سے گہرا یارانہ تھا گو اس نے نجمہ کے بارے میں مجھے تو کچھ نہ بتلایا' مگر واپس آکر میرے بارے میں اس کو پوری طرح باخبر کردیا۔ اصل میں جپسولوجسٹ جو زیادہ تر گورے سکالر یا ادیب ہوتے ہیں اور پچھلے کوئی ایک سو برس سے جپسی لوگوں پر تحقیق و تاریخ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں' وہ عمومی طور پر جپسیوں کی نقل و حرکت کو صیغہ راز میں رکھتے ہیں۔ کیونکہ جپسیوں کے اکثر پیشے مغرب کے قوانین کی رو سے غیر قانونی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس شرط کے بغیر جپسی کسی اجنبی سے دل کی بات کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

خیر اس بار بھی نجمہ نے پچھلی بار کی طرح ٹال مٹول کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک دن میں نے ذرا خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نجمہ نہ ملنا ہو تو نہ ملو' مگر ایک بات یاد رکھنا کہ تمہارے اس رویہ سے مجھے شدید دکھ کا احساس ہوگا۔ کیونکہ میں گورا امریکی نہیں ہوں جس سے تمہیں خطرہ ہو۔ میں تو تمہارے ماضی کے ملک سے چند دنوں کے لئے یہاں مہمان بن کر آیا ہوں اور جلد ہی واپس لوٹ جاؤں گا۔ اور اس کے بعد شاید پھر کبھی یہاں آنا نصیب ہی نہ ہو۔ بس یہ تم سے میری آخری درخواست ہے۔"

نجمہ پر غالبا" میری چھوٹی سی جذباتی تقریر کا اثر ہوا۔ وہ نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہنے لگی "نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں واقعی بہت مصروف ہوں۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ امریکی طرز زندگی کتنی جان توڑ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا بھی کوئی گھر ہو اس کے لئے ہر وقت جانوروں کی طرح کام میں جتی رہتی ہوں۔ بس اور کوئی بات نہیں۔ میں چاہتی تھی کہ تم اس وقت یہاں آتے جب میرا بھی کوئی اپنا گھر ہوتا۔"

میں نے کہا' "خدا کرے تمہارے کئی ایک گھر ہوں۔ مگر مجھے تو تمہارے گھروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے تو اپنے گھر سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔" پھر مجھے خیال آیا کہ شاید جپسی یا خانہ بدوش کے دل میں گھر سے بڑھ کر کوئی اور تمنا ہی نہ ہوتی ہو۔ کیونکہ جپسی یا خانہ بدوش تو ہوتا بھی وہی ہے جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ پھر میں نے ہنس کر کہا۔

"نجمہ، اگلی بار میں آیا جب تمہارا اپنا گھر ہو گا تو میں تم سے ملنے بھی نہیں آؤں گا۔ کیونکہ پھر تو تم جپسی ہی نہیں رہو گی۔" نجمہ یہ سن کر زور سے ہنسی اور پھر مانوسیت کا لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تم ایسا کرو کہ اگلے ہفتہ، سنیچر کی رات، ۸ بجے پبلک اسکول کے تھیٹر میں ایک پاکستانی شو منعقد ہو رہا ہے جس میں میری پرفارمنس بھی ہے۔ دس ڈالر کا ٹکٹ لینا پڑے گا بس وہاں چلے آنا، ملاقات رہے گی۔"

"تو کیا تمہارا شوہر لازارو بھی وہاں ہو گا، میں ان سے بھی ملنا چاہوں گا۔" میں نے کہا۔

"لازارو اکثر ان محفلوں میں نہیں جاتا، مگر چلو تمہیں ملانے کے لئے میں اُسے بھی ساتھ لیتی آؤں گی۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"اف، دنیا بھر میں بھٹکتے ہوئے بے چارے یہ جپسی۔" میں نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

۵۳ ویسٹ اسٹریٹ، مین ہیٹن میں پاکستانی شو کا بندوبست کراچی کے ٹی ۔ وی آرٹسٹ ماجد جہانگیر نے کیا تھا، جس میں زیادہ تر پاک ہند کے شوقیہ فنکار شامل تھے جو امریکہ میں رہتے تھے۔ پاکستانی معیار کے مطابق یہ شو نہایت گھٹیا اور بدنظمی کا شکار تھا۔ اور شائقین کا معیار بھی سونے پر سہاگہ سے کم نہیں تھا مگر پھر بھی نجمہ کا کتھک ناچ اور ایک ہندوستانی جوڑے کا بھنگڑا ناچ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

نجمہ اور اس کے شوہر لازارو، شو کے شروع ہونے سے قبل میرے ساتھ ہی آن بیٹھے اور اس طرح تھوڑی دیر ان سے بات چیت کا موقعہ میسر آیا۔ لازارو نے بتلایا کہ وہ یونانی جپسی ہے اور بچپن میں ہی امریکہ چلا آیا تھا۔ کوئی پچیس برس قبل ایک بار اس نے نجمہ کو ناچتے دیکھا اور دل دے بیٹھا۔ تب سے وہ خاوند بیوی کے رشتہ میں منسلک ہیں۔ ان کا ایک لڑکا آندریو بھی تھا جو موٹر مکینک کا کام کرتا تھا۔

نجمہ کا خیال تھا کہ وہ حیدر آباد دکن کے قریب کسی بنجارا خانہ بدوشوں کے کیمپ میں پیدا ہوئی تھی۔ مگر پچاس کی دہائی کے درمیان میں وہ ہندوستان کے قومی فنکاروں کے طائفے میں شامل ہو کر یورپ آئی اور پھر وہیں رہ گئی۔ اس نے بتلایا کہ جپسیوں پر تحقیق کرنے کے لئے امریکہ بہت غلط جگہ ہے۔ یورپ کے جپسی بہت دلچسپ لوگ

ہیں، بڑی بڑی بستیوں میں رہتے ہیں اور ملنسار بھی ہیں اور مہمان نواز بھی۔ اس نے بتلایا کہ جب انہیں پتہ چلا کہ وہ ہندو پاک کی رہنے والی تھی تو انہوں نے اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ نجمہ نے بتلایا کہ اسے یورپ کے جپسیوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا مگر جب اس نے جپسی کیمپوں میں ایسے جملے سنے "تو کی کرے؟" تو کیا کر رہی ہے؟ تو وہ حیران رہ گئی۔ وہ اتنی پرانی ہندی بولتے ہیں کہ جسے اب ہندوستان کے لوگ بھی چھوڑ گئے ہیں۔ نجمہ کے مطابق جپسی رومنی زبان راجستھان کی مارواڑی اور گجراتی زبان سے بہت قریب ہے۔

"نجمہ تم نے کتھک کا اتنا اعلیٰ رقص کہاں سے سیکھا۔" میں نے پوچھا۔

"میرے گرو جے پور کے رہنے والے تھے اور یہ ان کی دین ہے۔"

"جے پور ـــــــ؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیوں! کوئی عجیب بات ہے؟" نجمہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں نجمہ" میں نے کہا۔ "بہت عجیب اتفاق ہے۔ دیکھو تو ہم خانہ بدوشوں کی زندگی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ تم نے حیدر آباد دکن کے قریب زندگی کی ابتداء کی اور جے پور آن کر پروان چڑھی جبکہ میں جے پور کے قریب پیدا ہوا اور حیدر آباد سندھ آکر پروان چڑھا۔ اور آج رات ہم نیویارک میں ملے تو بھی روز اول کی طرح بے گھر اور خانماں برباد۔"

نجمہ یہ سن کر خانہ بدوشوں کی سی لاابالی پن کے ساتھ زور سے ہنسی اور پھر بڑی گرم جوشی کے ساتھ خدا حافظ کہہ کر سائے کی طرح غائب ہو گئی۔

(۲۳)

خواب

کبھی کبھی انسان کے سب خواب پورے ہوجاتے ہیں۔ وہ بھی جو حقیقی زندگی سے چنداں مطابقت نہیں رکھتے۔ میں بچپن سے ہی خوابوں کی دنیا میں کھویا رہا ہوں۔ صحرا میں جنم لینے والا انسان خواب دیکھنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ پھر بھی خواب دیکھنا تو غالباً" فطری سی بات ہے مگر ان کا پورا ہوجانا غیر معمولی بات ضرور ہوسکتی ہے۔"

میں بچپن میں ایک راجہ کے مہمان کے طور پر محل میں ٹھہرا۔ میں نے جوانی میں ایک بادشاہ سے ہاتھ ملایا ہے۔۔ کیولری افسر' شہسواری' پولو' کوہ پیمائی' سیاحت' صحافت اور بھرپور رومانوی دنیا۔ غرضیکہ کل زندگی ایک خواب کی مانند رہی ہے۔ مگر ۲۲ جولائی ۱۹۸۸ء کو نیویارک میں ایک اور خواب پورا ہوا جس کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد مجھے اپنے آپ سے خوف آنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ میں کہیں بہت مختصر سی زندگی تو لے کر پیدا نہیں ہوا۔ اور پھر خود ہی اپنے کو ولاسا دیا کہ زندگی خواہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو' پر اگر بھرپور طور پر گزرے تو کف افسوس ملنے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔

۱۹۵۳ء میں گورنمنٹ کالج حیدر آباد میں ۱۷ سال کی عمر میں داخل ہوا تو اگلے تین سال تک لانگ جمپ' ہائی جمپ اور پول والٹ وغیرہ کی فیلڈ ایونٹس Field-Events میں شاذ و نادر ہی کسی کو بازی لے جانے دی۔ ۱۹۵۶ء میں جب کیڈٹ کے طور پر میں ملٹری اکیڈمی کاکول پہنچا تو پہلے سالانہ کھیلوں میں میرا نام چار تیز ترین دوڑنے والوں میں شمار ہوا۔ غالباً" اس کے تین سال بعد میرے چھوٹے بھائی شوکت نے ۱۸ سال کی عمر میں گورڈن کالج راولپنڈی کے کھیلوں کے مقابلہ میں ۱۹۵ فٹ

۱۰ انچ کے فاصلہ پر نیزہ Jevellian پھینک کر پنجاب یونیورسٹی کا نیا ریکارڈ قائم کیا' جبکہ اس زمانہ میں قومی ریکارڈ ۲۱۰ فٹ تھا۔ خیر شوکت بہت غیر معمولی اتھلیٹ تھا اور اگر وہ کسی ترقی یافتہ ملک میں جنم لیتا تو بلاشبہ نام پیدا کرتا۔ میرے والد بھی اپنی جوانی کے دنوں میں آل انڈیا کیولزی گھوڑ سوار دوڑ میں نام پیدا کرچکے تھے۔ اس قسم کے خاندانی پس منظر میں ظاہر ہے ورلڈ اولمپکس دیکھنا یا امریکہ کے کارل لیوس Lewis Carl جیسے نامور شیدی ایتھلیٹ جس نے دو اولمپکس میں چار چار گولڈ میڈل حاصل کئے ہوں اور جو دنیا کا تیز ترین دوڑنے والا انسان ہو' اس سے ہاتھ ملانے کا تو کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ مگر اس دن یہ خواب بھی پورا ہوا۔

ہوا یوں کہ کولمبیا یونیورسٹی کے وینی اسٹیڈیم میں امریکہ کے قومی مقابلے منعقد ہوئے۔ میں بھی وہاں پہنچا اور حسن اتفاق کہ مجھے اگلی قطار میں بیٹھنے کی جگہ مل گئی اس مقابلہ میں کارل لیوس نے ۲۸ فٹ سے اوپر لمبی چھلانگ لگائی اور پھر فاتحانہ انداز میں دوڑتے ہوئے اسٹیڈیم کا چکر لگایا تو لوگوں نے کھڑے ہوکر داد دی۔ جب وہ میرے سامنے سے گزرا تو دوسرے چاہنے والوں کی طرح میں نے بھی اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے خواب کی مانند سامنے سے گزر گیا۔

اس دن میں نے کیوبا کے سوٹومائر کو آٹھ فٹ سے اونچی چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ ٹم برائیٹ Tim Bright کو ۱۸ فٹ ۸ انچ اونچی چھلانگ لگا کر پول والٹ کرتے دیکھا۔ سیول اولمپکس کوریا کی مشہور گولڈ میڈلسٹ شیدی لڑکی کرسی جونیئرز کو ۴۴۰ گز کی ہرڈل دوڑ میں ہرنی کی طرح برق رفتاری سے ہوا میں تیرتے دیکھا۔ نہ صرف یہ بلکہ کینیا کے ایک میل کی دوڑ کے نامور ایتھلیٹ ' ولسن میگوا' بائیک بوئیت اور کپ کنو کو لوہا منواتے دیکھا۔

مگر ایک خواب ابھی ایسا ہے جسے میں نے بہت پیار سے بار بار دیکھا ہے اور جس کے لئے بیش بہا ذاتی قربانیاں بھی دیں۔ مگر وہ شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا اور وہ ہے پاکستان میں حق و انصاف' امن و آشتی' معاشی و سماجی ترقی کے لئے انقلابی جدوجہد کا خواب۔

جب بھی میں سندھ کے کسانوں' ہاریوں کو دیکھتا ہوں' جن کے پیروں میں اگر جوتیاں ہوں تو پیٹھ ننگی ہوتی ہے اور اگر پیٹھ ڈھکی ہو تو پیروں سے ننگے انہیں فاقہ زدہ

دیکھ کر دل بھر آتا ہے۔ کتنی صدیاں بیت گئیں، میں اپنے آپ سے کہتا، مگر سندھ کے جاگیرداروں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان کے بال بچے ہر وقت غیر محفوظ رہتے ہیں اور ان کے گھروں میں کبھی فاضل اناج نہیں ہوتا۔ بھوک اور بیماری ہر وقت ان کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ جو کچھ روزمرہ کی محنت سے کماتے ہیں قصائی نما ڈاکٹروں کی نظر کر آتے ہیں۔ جب میں سندھ کی اس اکثریتی آبادی اور کچلی ہوئی انسانیت کو زمینداروں، پولیس اور رسہ گیروں کے ہاتھوں دن رات لٹتے پٹتے دیکھتا ہوں تو میرا ایمان اور بھی پختہ ہوجاتا ہے کہ ان کی نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے طبقاتی انقلاب۔

ایوب خان کے آخری دور تک طبقاتی انقلاب کی ہوائیں پاکستان میں واقعی تیز ہوگئی تھیں اور کسان اب نجات کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ مگر زمیندار، ان کی فوج اور ان کے دیگر لٹھ بردار اتنی آسانی سے ان کی جان چھوڑنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے ترقی پسندی اور قوم پرستی کے نام پر ایسی چال چلی کہ وہ سب خواب چکنا چور ہوگئے۔ مگر بے بس انسان خواب دیکھنا کبھی بند نہیں کرتا۔ خوابوں کی دنیا کے سوا ان کے پاس اور ہوتا بھی تو کچھ نہیں۔ اسی کیفیت میں میں نے ایک بار ایک نظم لکھی تھی جس کا آخری شعر یہاں دینا چاہوں گا۔

"پر خوابوں کی دنیا سے میں مایوس نہیں
شب غم میں ستارے تو جگمگائیں گے
چن چن کہ خوابوں کو پھر بنالیں گے محل
خواب جو ہیں، ٹوٹ گئے پھر آجائیں گے"

(۲۴)

بھیل بستی

بنجارا خانہ بدوش نجمہ ”آئینے کی طرح غالبا“ میں بھی عمر بھر کی خانہ بدوشی سے تنگ آکراب اپنے لئے ایک مستقل چھت کے نیچے زندگی بتانے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ گو کہ سندھ کے دیہات میں باپ نے وفات کے وقت جو زمین چھوڑی تھی وہ اتنی کم تھی اور اس کے حصہ دار اتنے زیادہ کہ میرے حصہ میں بمشکل ڈھائی ایکڑ زمین آئی تھی۔ مگر باوجود اس کے اس پر بھیل ہاریوں کے درجنوں گھر آباد تھے اور میرے لئے ان کو اس حالت میں بے آسرا چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا ممکن نہیں تھا۔ ایک بار میں نے اپنی بستی کے ایک نوجوان بھیل کسان سے پوچھا کہ اگر بھگوان تمہاری خواہشات پوری کرنے پر اتر آئے اور کہے ’ مانگو بچہ کیا مانگتے ہو‘ تو تم کیا مانگو گے؟ تھوڑی دیر سوچ کر اس نے کہا’ اگر بھگوان مجھے ایک ایکڑ زمین بخش دے۔ جس کو میں اپنی کہہ سکوں تو دنیا میں مجھے سب کچھ مل جائے‘

ظاہر ہے ایک طویل عرصہ تک ان نیم خانہ بدوش بھیلوں کے ساتھ رہنے کے بعد میں بھی اب اتنا قناعت پسند ہوگیا تھا کہ اس سے زیادہ مجھے بھی زمین کی ملکیت کی خواہش نہیں رہی تھی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ جاگیردارانہ نظام نوآبادکار دور کی باقیات کے طور پر کس قدر ظالمانہ اور آمرانہ مزاج کا حامل ہے اور میں کسی بھی قیمت پر اس نظام کا حصہ بننے کو تیار نہیں تھا۔

۱۹۸۶ء میں باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی خاندانی فارم کے حصے بکھرے ہونے شروع ہوئے تو ان بھیلوں کے اجڑنے کا خطرہ پیدا ہوگیا اور دوسری

طرف اسی زمانہ میں دیہات ڈاکوؤں کی آماجگاہ بن گیا۔ چونکہ میرے دوسرے بھائی ملازم پیشہ تھے اور میں ان سب میں بڑا بھی تھا' تو بھیلوں نے مجھ سے التجا کی کہ میں ان کے ساتھ ہی فارم پر آرہوں۔ اس لئے بھی کہ بھیل ڈاکوؤں سے زیادہ پولیس سے خائف تھے اور اکثر اوقات سندھ میں پولیس اور ڈاکوؤں میں تمیز کرنا خاصا مشکل کام رہا ہے۔

چار و ناچار مجھے بھی ان بھیلوں کے درمیان اپنی کٹیا بنانی پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکوؤں کے اجاڑے ہوئے درجنوں دوسرے بھیل خاندان پناہ کی صورت میں ہماری بستی میں آن شامل ہوئے۔ اور یوں یہ بستی اب پھیل کر کوئی چالیس بھیل گھرانوں پر مشتمل ہوگئی۔ اگلے دو سال تک ہم نے ڈاکوؤں کا کس طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا اس کا احوال کسی اور وقت پر چھوڑتا ہوں۔ فی الحال ذکر نیویارک کا ہورہا تھا۔

نیویارک میں جوں جوں میرے واپس لوٹنے کا وقت قریب آنے لگا' اسی شدت کے ساتھ مجھے بھیل بستی کی یاد ستانے لگی۔ ایک ایسی پریم بھری بستی جہاں کبھی بچوں یا دو عورتوں کو آپس میں جھگڑتے نہیں دیکھا۔ بچوں کی طرح معصوم اور بھلے لوگ تھے۔ مگر عزت نفس رکھنے والے ایسے خوددار لوگ کہ جب ' چور ڈاکوؤں کا خطرہ سر پر منڈلانے لگا تو انہوں نے بیل بیچ کر لائسنس دار ہتھیار خرید کر عزت بچانے کو ترجیح دی۔ سندھ کے چور' ڈاکو بہت گھٹیا کردار کے حامل ہوتے ہیں اور عورتوں اور بچوں کی بے حرمتی کرنے کو برا نہیں سمجھتے۔ مگر ہماری بستی کے بھیلوں نے بے حرمتی کی بجائے جان دینے کا وچن کیا۔

مجھے اب امریکہ میں چار مہینے پورے ہونے کو تھے۔ وہ میری ہر صبح راہ تکتے ہوں گے' میں نے سوچا اور بوریا بستر باندھ کر واپسی کی تیاری کرنے لگا۔ میرے نیویارک چھوڑنے سے چند دن قبل' میرے امیر میزبان دوست نے ڈاؤن ٹاؤن مین ھیٹن میں کوئی آدھے میلین ڈالر کی لاگت سے ایک بڑا سا اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔ اس اپارٹمنٹ میں جو حمام بنا تھا' اس میں غسل کرتے وقت چاروں طرف سے اس زور سے فوارے چھوٹتے کہ نہانے والے کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے بدن کی مالش کی جارہی ہو۔ اس میں ایک تھرمااسٹیٹ وال کے ذریعہ پانی کے درجہ حرارت کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔

جب کوئی مہمان سڑک پر کھڑا عمارت کے بڑے بند دروازے پر اندر آنے کے

لئے گھنٹی بجاتا تو اوپر کی چھٹی منزل پر جہاں یہ اپارٹمنٹ تھا' ایک چھوٹے سے ٹیلی ویژن پر آواز کے ساتھ اس کی تصویر بھی دکھائی دیتی تاکہ آپ پہچان سکیں کہ وہ کوئی بن بلایا مہمان یا چور ڈاکو تو نہیں۔

"سوچ لو اچھی طرح سے۔" میرے دوست نے مجھ سے کہا۔ "جب تم ۱۹۷۴ء میں واشنگٹن ڈی سی سے واپس لوٹے تھے' تب بھی میں خوش نہیں تھا اور اب تم پھر سے وہی غلطی دہرا رہے ہو۔ سندھ میں حالات بہت خراب ہیں۔ شہروں میں کشت و خون کا بازار گرم ہے' اور دیہات میں لوگ مال مویشی کی طرح اٹھائے جا رہے ہیں۔ اور تم اتنے ناشکرے ہو کہ یہ سب آسائشیں تیاگ کر واپسی کے لئے تڑپ رہے ہو۔"

"ہاں' مقدر جو ٹھہرا۔" میں نے کہا۔ "یوں بھی اب دیر ہو چکی ہے۔ ماں اور باپ کی وہاں ہڈیاں دفن ہیں۔ اب کہیں اور جانے کو دل نہیں چاہتا۔ اب تو خانہ بدوشی اور پناہ گیری سے دل اکتا گیا ہے۔ ایک گھر ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے دوسرا سندھ میں آگ کی زد میں ہے۔ کس منہ سے نیویارک میں سکون آئے گا؟ اور اس کی بھی کیا گارنٹی ہے۔ کچھ بھی ہو' اب تو واپس ہی لوٹنا ہے۔" میں نے ضد جاری رکھی اور بالاخر ویانا۔ امان اور دوبئی سے ہوتا ہوا رائل جارڈن ایرلائن کے ذریعہ کراچی اترا اور یوں نیویارک سے سیدھا بھیل بستی پہنچا۔

اسی رات دیر تک میں اپنے منشی بھیل کی مدد سے سامان کھول کر اپنی کٹیا کو سیٹ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اتنے میں بستی کے ایک پہرہ دار نوجوان نے آہستگی سے آکر خبر دی کہ ساتھ والی نہر کی پٹڑی پر ابھی ابھی چند ایک ڈاکو گزرے ہیں۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ وہ ڈاکو تھے؟" میں نے پوچھا۔ کسان نے گھبرائی ہوئی آواز میں بتلایا کہ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے اور بدن پر گولیوں کے بنڈولیر اور چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔

"ہاں صاحب' یہ تو روز کا معمول ہے۔" منشی نے کہا۔ "مگر ہمارے پاس ہے ہی کیا جو ہم سے خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ کریں اور پھر وہ ہمیں آزما بھی چکے ہیں۔ تو بھی ہم ہر حالت کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اچھا آپ اتنے لمبے سفر سے آئے ہیں' تھک گئے ہوں گے' آرام کریں صبح تفصیل سے بات ہوگی۔"

نیند اور تھکاوٹ سے میری بھی آنکھیں بوجھل تھیں۔ میں نے اپنا پستول سرہانے رکھا اور پھر گھوڑے بیچ کر سوگیا۔

یوں تو چھوٹی سی بھیل بستی، چور، ڈاکوؤں کے ساتھ مزاحمت کے سلسلہ میں علاقہ بھر میں مشہور تھی۔ مگر پھر ایک ایسا اتفاق ہوا کہ جس کی وجہ سے اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ ہوا یوں کہ ایک بار میرے دوست اور سندھ یونیورسٹی کے فائن آرٹس کے شعبہ کے صدر مسٹر اے۔ آر۔ ناگوری جو اپنی وزاوڑی طرز کی مصوری کے لئے شہرت رکھتے ہیں، چند ایک جرمن عورتوں کو کراچی کے گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر مسٹر شیررر کے اصرار پر ساتھ لے کر بھیل بستی میں آ دھمکے۔ جرمن بھیل عورتوں کی رنگارنگ راجستھانی ثقافت، چندری، چوڑے اور چندن ہار اور ان پر لمبا گھونگٹ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

اے۔ آر ناگوری نے واپس جاکر بھیلوں کی قدیم ثقافت کے پیش نظر چند ایک مصورانہ تصاویر بنائیں، جن میں ایک مخصوص پینٹنگ، بھیل بستی، کے نام سے بہت مقبول ہوئی۔ یہ تصویر بھاری قیمت کے عوض سہگل خاندان نے خریدلی اور جو اب ان کے کولیکشن کے طور پر لاہور آرٹ گیلری میں محفوظ ہے۔

اب کیا تھا دوست اور احباب نے بھیل بستی کو دیکھنے کے لئے یلغار کردی۔ لہٰذا مجبوراً اپنے دوستوں کی میزبانی کے لئے مجھے اپنی خانہ بدوش نما کٹیا کو بدل کر "آشرم" کی شکل دینا پڑی۔

میں اب بھیل بستی کے عین بیچ، اپنے آشرم میں رہتا ہوں۔ میں نے اسے اپنی کتابوں، تصویروں، مجسموں اور دیگر نوادرات کے ساتھ سجالیا ہے۔ میں نے اس ضمن میں کچھ پھولدار بیلیں اور درخت بھی لگالئے ہیں، جن میں میری من پسند بوگن والائے، مدھو مالتی، گل مہور اور فلیم آف فارسٹ بھی شامل ہیں۔ ساون کی بارشوں کے بعد جب پھول کھلتے ہیں تو بھیل بستی کا یہ چھوٹا سا آشرم گلدستے کا روپ دھار لیتا ہے۔ بھیل بستی کی دیواروں کے اندر ہماری چھوٹی سی اپنی دنیا ہے۔ جب کہ دیواروں سے باہر سندھ کا نہایت سفاکانہ، جاگیردارانہ نظام اور ان کے پالتو، چور ڈاکو دن رات دندناتے پھرتے ہیں۔ چونکہ ہمارے پاس لڑنے بھڑنے کے لئے کوئی جاگیریں نہیں ہیں، اس لئے ہمارا پیغام صاف ہے "جیو اور جینے دو۔"

مصنف کے بارے میں

“سیپیاں اور پتھر” خورشید قائم خانی کی دوسری تصنیف ہے۔ اس سے پہلے بھٹکتی نسلیں، اتفاقاً میرے ہاتھ لگی۔ میں ان کے نام سے نا آشنا نہیں تھا کہ اس کتاب کی پہلی اشاعت سے کوئی دو برس پہلے ان کے قلم سے چمکتی دمکتی انگریزی میں لکھا ہوا اپنے مرحوم باپ کا دل آویز “پروفائل” میری نظروں سے گزر چکا تھا۔ ایسے “پروفائل” میں نے کم پڑھے ہیں اور کراچی کے ایوننگز STAR اسٹار، کا یہ تراشا اب بھی میرے کاغذوں میں محفوظ ہے۔

اردو میں ایسی کتابیں جو ہمیں فطرت کے قریب لے آئیں یا جن سے ہماری دوستی ہو جائے، عام نہیں (انگریزی میں جارج بارو کے “لیونگرو” اور ڈبلیو۔ ایچ۔ ہڈسن کی “ایک گڈریئے کی زندگی” A Shephard's life میرے ذہن میں آتی ہیں) جپسیوں، سیاہ فاموں، ریڈ انڈین اور دیگر دراوڑوں کے بارے میں درد مندی اور محبت سے لکھی ہوئیں پہلے “بھٹکتی نسلیں” اور اب “سیپیاں اور پتھر” ایسی ہی کتابیں ہیں۔

ہم اکثر ایسے امارت پرست (Snap) لوگوں سے ملتے ہیں جو اپنی انسان دوستی اور خدا ترسی کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے۔ لیکن ان میں انسان دوستی ہوتی ہے، نہ خدا ترسی۔

اس کتاب کے مصنف میں یہ صفات رچی بسی ہیں۔ ان کی روح ایک آوارہ جپسی (Wandering Gypsy) کی روح ہے جو انہیں قرار و سکون سے اپنے ڈیرے میں نہیں بیٹھنے دیتی۔ ایک سچے جپسی کی طرح انہیں دولت کی ہوس ہے، نہ شہرت کی طلب۔ وہ اندرون سندھ اپنی برائے نام چھوٹی موٹی زمینداری پر جس میں ایک بھیل نوجوان ان کا شریک کار ہے، قانع ہیں۔

اس طرح “سپیاں اور پتھر” جپسیوں یا بھٹکتی نسلوں کے بارے میں ایک ایسے ذہین، پڑھے لکھے، جپسی کی لکھی ہوئی ہے جو خود کو ان سے برتر خیال نہیں کرتا۔ خورشید قائم خانی ایک غیر معمولی انسان ہیں اور “سیپیاں اور پتھر” ایک غیر معمولی کتاب۔

محمد خالد اختر
(کراچی)

فکشن ہاؤس
۱۸۔ مزنگ روڈ، لاہور

پڙهندڙ نسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، چُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوُٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنيٰ e-books ٺاهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاريِ تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعويٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا

ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بِہ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيلا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، ٻَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. ٻين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصي ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَبِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَن پاران ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي ڪُليل اڪرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڌِ کان وَڌِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجھہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيھہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجھہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم - گولو، جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَّ ۽ چَمَ جو ساٿي آ -

اِن حسابَ سان اڄاڻائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَ جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، چالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي پنهنجو حق، فرض ۽ اٽٿر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻَ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا، بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ڀاڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ڀاءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪي جو ٻيجل ٻوليو